جماعتِ اسلامی

پر

ایک نظر

از

شیخ محمد اقبال ایم۔ اے

فہرست

حکیم الامّت علّامہ اقبالؒ

کی یاد میں

کہتا ہُوں وُہی بات سمجھتا ہُوں جسے حق

نے ابلۂ مکتب ہُوں نہ تہذیب کا فرزند

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخُوش

میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند!

مسلم لیگ اور اسلامی جماعت کے مسلک

مسلم لیگ

"کیا اسلام اور مسلمانوں کی خدمت ایک وقت میں
نہیں کی جا سکتی
اگر نہیں تو کیوں"

(مولانا مودودی سے ایک لیگی لیڈر کے سوالات)
مندرجہ ترجمان القرآن جون ۱۹۴۷ء ص ۱۱

اسلامی جماعت

"اسلام کی لڑائی اور (مسلمانوں کی) قومی لڑائی ایک
ساتھ نہیں لڑی جا سکتی (مولانا مودودی)
ترجمان القرآن مئی ۱۹۴۷ء ص ۶۵

(بین القوسین الفاظ ہمارے ہیں۔ اور مولانا کے مضمون
کے باقی حصے پر مبنی ہیں)

پیش لفظ

راقم السطور کو قومی رسائل اور اخبارات پڑھنے کا بچپن سے شوق رہا ہے۔ اور اتفاق ایسا ہوا کہ ترجمان القرآن اور جماعتِ اسلامی کے دُوسرے اخبارات و رسائل کے مطالعہ کا خاص طور پر موقع ملا۔ جماعتِ اسلامی کو آج جو اہمیت حاصل ہے وُہ آج سے دس بارہ برس پہلے نہ تھی۔ ہمیں یاد ہے کہ ۱۹۳۸ء میں ترجمان القرآن کی اشاعت تین چار سو سے متجاوز نہ تھی۔ چنانچہ جماعت کی گذشتہ تاریخ اور اس کے بُنیادی عزائم کے متعلق عوام کو صحیح واقفیت حاصل نہیں۔ ہم نے آئندہ صفحات میں اِس کمی کو پُورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور جماعتِ اسلامی کی رپورٹوں۔ ترجمان القرآن اور کوثر کے فائلوں اور دُوسرے مستند ذرائع سے جماعت کی تاریخ مرتّب کی ہے۔ اِس کے علاوہ پاکستان کے آئینی مستقبل کی نسبت مسلم لیگ اور اسلامی جماعت میں جو اختلاف روزِ اوّل سے رہا اور اب بھی ہے۔ اس کا تفصیلی تجزیہ کیا ہے۔

جو مسائل اِس کتاب میں آئے ہیں ان کا پاکستان کے مستقبل پر گہرا اثر پڑے گا۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اِس وقت جو تجربہ پاکستان میں ہو رہا ہے اِس کی کامیابی اور ناکامیابی کا اثر تمام عالمِ اسلامی پر ناگزیر ہے۔ اسی لئے ہم نے تلخ حقائق کے بیان سے احتراز نہیں کیا اور کوئی لگی لپٹی نہیں رہنے دی۔ ممکن ہے بعض حضرات کو ہماری رائے سے اختلاف ہو لیکن ہم نے اپنی طرف سے اِس امر کی بڑی کوشش کی ہے۔ کہ بیانِ واقعات میں صحت اور توازن کا پورا پورا خیال رکھا جائے۔ جماعتِ اِسلامی کی تاریخ مرتب کرتے وقت ہم نے زیادہ تر اسی جماعت کی کتابوں۔ رسالوں اور اخباروں پر حصر کیا ہے۔ اور مولٰینا مودودی اور تحریکِ جماعتِ اِسلامی کے متعلق مولٰینا کو قریب سے جاننے والوں سے بھی تحقیق و تفتیش کی ہے۔ لیکن زبانی اِطلاعات کو سوائے

اس صورت کے کہ ان کی حیثیت غیر اختلافی ہو، اِس کتاب میں جگہ نہیں دی۔ اس پر بھی اگر واقعات بیان کرنے میں کوئی سہو و خطا ہو گئی ہے تو ہم اس کی اِصلاح کے لئے بخوشی تیار ہیں۔ اور جو صاحب ہیں اِس سے آگاہ کریں گے ہم اُن کے ممنون ہوں گے۔

آئندہ صفحات کی نسبت ہمیں زیادہ کہنا نہیں۔ البتہ ایک بات کی وضاحت ضروری ہے۔ اس کتاب میں ہم نے جابجا مسلم لیگ کا ذکر کیا ہے۔ اِس وقت بدقسمتی سے ملک میں ایک سے زیادہ مسلم لیگیں قائم ہو گئی ہیں۔ ایک پاکستان مسلم لیگ ہے جس کے صدر عزت مآب خواجہ ناظم الدین وزیرِ اعظم پاکستان ہیں۔ دوسری جناح عوامی مسلم لیگ ہے جو جناح مسلم لیگ (جس کے بانی نواب صاحب ممدوٹ تھے) اور عوامی مسلم لیگ (جس کے لیڈر مسٹر حسین شہید سہروردی تھے) کے باہمی اتحاد سے قائم ہوئی۔ اِس کتاب میں جہاں کہیں "مسلم لیگ" کا ذکر آیا ہے اُس سے ہماری مُراد ان میں سے کوئی خاص لیگ نہیں ہے۔ بلکہ ہمارا اِشارہ اس مسلم لیگ کی طرف ہے جس کی قیادت قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ نے کی۔ اور جس نے پاکستان کا مُطالبہ پیش کیا، اور اس کی کامیابی کے لئے جدوجہد کی۔ آئندہ کی نسبت کوئی پیشین گوئی نہیں کی جا سکتی۔ مگر اس وقت تک کیفیت یہ ہے کہ ملک میں جو مختلف جماعتیں مسلم لیگ کے نام سے موجود ہیں، ان سب کا منتہائے مقصود وہی ہے جو قائدِ اعظمؒ کا تھا یعنی پاکستان میں ایک اِسلامی جمہوریت (ISLAMIC DEMOCRACY) کا قیام۔ ان سب کے برخلاف اسلامی جماعت کا مطمحِ نظر عملی صورت میں مذہبی حکومت (THEOCRACY) کا قیام ہے۔ اس کے علاوہ قائدِ اعظمؒ کی طرح یہ تمام جماعتیں اِسلام اور قومیت کے درمیان اس بنیادی تضاد کی قائل نہیں جس کا علم بلند کر کے جماعت اِسلامی نے مسلم لیگ اور تحریکِ پاکستان کی مخالفت کی۔ یہ جماعتیں "ملی مفاد" کو جماعتِ اِسلامی کے اہل الرائے بزرگوں کی طرح ایک "خطرناک بُت" نہیں سمجھتیں۔ "جسے توڑے بغیر اسلام کا مفاد پورا نہیں کیا جا سکتا" اور وہ نہ صرف مسلمانوں کی دینی ضروریات بلکہ ان کی دنیوی ترقی اور پاکستان کی مادی عظمت و استحکام کی بھی خواہاں اور اس کے لئے کوشاں ہیں۔

ہم نے اِس کتاب کو حکیم الامت علامہ اقبالؒ کی یاد سے وابستہ کیا ہے۔ اس سے ہمارا مدعا ذاتی ارادت وعقیدت کا اظہار اور اس فیضان کا شکریہ ہے جو ہمیں ذاتی طور پر علامہؒ کی ذات سے پہنچا۔ لیکن ہمیں اس امر کا بھی یقین ہے کہ اگر پاکستان کو اپنے عظیم الشان مشن میں کامیاب ہونا ہے تو اسے حضرت حکیم الامت کی تصانیف کو، جو حکمت قرآنی کے نور سے درخشاں ہیں، مشعلِ راہ بنانا پڑے گا۔ اس وقت پاکستان کے سامنے دو مخالف و متضاد زاویہ ہائے نگاہ ہیں۔ ایک طرف تو جماعت اسلامی والے ہیں۔ ان کے نزدیک قوم کا اپنے نفع ونقصان کو سوچنا گویا ایک گناہ ہے۔ دُوسری طرف اشتراکی ہیں۔ جن کے سامنے مادی مصلحتوں اور دنیوی نفع ونقصان کے سوا کچھ نہیں۔ اب اگر قوم کو اس افراط اور تفریط سے بچنا اور پھر "فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً" کا صحیح اسلامی راستہ اختیار کرنا ہے تو اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اسلام کے سب سے بڑے فلسفی اور مفکر کے نتائج غور وفکر کو زادِ راہ بنایا جائے۔ جس نے برسوں قرآن کریم کا عمیق مطالعہ کیا اور اس کی روشنی میں مسائلِ حاضرہ کا حل پیش کیا۔

محمد اقبال

کراچی

۴ر جولائی سنہ ۱۹۵۲ء

جماعتِ اسلامی کی تاریخ

(پاکستان سے پہلے)

پہلی جماعتِ اسلامی مولانا مسعود عالم ندوی کی تالیف "مولانا سندھی کے افکار وخیالات پر ایک نظر" کے مقدمے میں مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں :-

"جنگِ عظیم کے بعد سے جو مسلمان نوجوان یورپ کو گئے وُہ سوشلزم یا نازی ازم میں سے کسی ایک کا شکار ہو آئے۔ پہلا نظریہ دہلی کے خیری برادرس کی جماعتِ اسلامی اور امرتسر کے مشرقی صاحب کی خاکسار تحریک کی صورت میں ظاہر ہُوا۔ خیری بھائیوں کی تحریک تو ان کے گھر کی چاردیواری ہی میں محدود رہی۔ ان کا بڑا زور وحدتِ آمریت پر تھا لیکن مذہبی اصول وفروع میں انہوں نے تاویل نہیں کی"

ان سطور کے متعلق جماعتِ اسلامی کا اخبار کوثر لکھتا ہے :-

"جماعتِ اسلامی کے امیر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور ان کے بھائی ابوالخیر مودودی بھی دہلی کے رہنے والے ہیں اور ابوالخیر کی مناسبت سے ان پر خیری برادرس کا دھوکہ ہوتا ہے۔ حالانکہ خیری برادرس ایک دوسرا گھرانا ہے جس سے مولانا عبدالجبار خیری مولانا عبدالغفار خیری اور پروفیسر عبدالستار خیری مرحوم مراد ہیں پروفیسر عبدالستار خیری مرحوم جرمنی گئے تھے۔ مولانا عبدالجبار اس نظریے کے معتقد تھے جس کی طرف مولانا سید سلیمان ندوی نے اشارہ فرمایا ہے۔ انہوں نے ایک جماعتِ اسلامی کی داغ بیل بھی ڈالی۔ مولانا ابوالاعلیٰ کو بھی دعوت دی تھی۔ مگر مولانا وحدت آمریت اور بعض دُوسرے امور میں اتفاق نہ کر سکے۔ اور مولانا عبدالجبار اور ان کے بھائی اپنے نظریے کے مطابق اپنی راہ پر چلے گئے۔

مولانا سید سلیمان ندوی نے اس صورتِ حال کی طرف اشارہ کیا ہے"

کوثر نے تو خیری برادرز، مولانا مودودی، ان کی دعوت اور دونوں کے بعض اختلافات کا ذکر چند لفظوں میں کیا ہے لیکن دہلی کے باخبر اور معتبر حضرات کا قول ہے کہ مولانا مودودی ایک مدت تک خیری برادرز کے جلسوں میں گاہے گاہے شریک ہوتے رہے۔ جماعتی تنظیم اور پراپاگنڈا کے جو اصول مولانا عبدالستار خیری جرمنی سے سیکھ کر آئے تھے وہ ان سے اخذ کئے۔ انہوں نے مولانا عبدالجبار خیری کی وحدت آمریت پر توآمنّا وصدقنا نہ کہا لیکن جو تحریک خود انہوں نے بعد میں چلائی۔ اس میں خیری برادرز کی تحریک کی بہت سی خصوصیات شامل تھیں۔ چنانچہ جماعت کا نام بجوں کا توں وہی ہے جو بقول سید سلیمان ندوی ایڈیٹر کوثر خیری برادرز نے اپنی جماعت کا رکھا تھا یعنی "جماعتِ اسلامی"

مولانا مودودی کے متعلق اُن کے ایک پُرانے واقفِ حال کی تفصیلی تحریر

مولانا مودودی نے اپنی جماعتِ اسلامی کی بنیاد ۱۹۴۱ء میں رکھی جب ان کی عمر ۳۸ سال کی تھی۔ اس سے پہلے بھی اُنہوں نے کئی صحافتی اور اجتماعی سرگرمیوں میں حصہ لیا۔ مولانا کے خیالات اور رجحانات کا اندازہ لگانے کے لئے اس پس منظر پر بھی نظر ڈالنی ضروری ہے اور اس مقصد کے لئے شاید ذیل کا خط دلچسپی سے پڑھا جائے۔ جو اخبار جنگ (کراچی) میں ۱۴۔ نومبر ۱۹۴۹ء کو شائع ہوا تھا:۔

میں مولانا مودودی کو جانتا ہوں

آپ کے موقر اخبار میں سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی بابت بہت سے خطوط شائع ہوتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والوں میں سے کوئی بھی سید صاحب سے پوری طرح واقف نہیں۔ میں مودودی صاحب کو ۳۵ سال سے جانتا ہوں۔ اور ان کے تمام حالات سے بہت اچھی طرح واقف ہوں۔ اس لئے مناسب سمجھتا ہوں کہ میں بھی کچھ عرض کروں۔ اختصار کے خیال سے پورے حالات تو بہرحال نہیں دیئے جا سکتے۔ مختصر عرض ہے کہ حصولِ علم وفضل کے بعد مودودی صاحب کی پبلک زندگی کا آغاز جمعیت العلمائے ہند

کے اخبار الجمعیۃ کی ایڈیٹری سے ہوتا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ جمعیت العلمائے ہند اول درجہ کی کانگریسی جماعت ہے۔ چنانچہ مودودی صاحب بھی اس وقت پکے کانگریسی اور مسلم لیگ کے سخت مخالف تھے۔ چند سال بعد الجمعیۃ کی مالی حالت خراب ہو جانے کی وجہ سے چونکہ سید صاحب کو چھ چھ ماہ تک تنخواہ نہ ملتی تھی۔ وہ وہاں سے الگ ہو گئے اور بظاہر کانگریسی بھی نہ رہے۔ لیکن لیگ سے اختلاف کبھی نہ گیا۔ بلکہ اب تک موجود ہے۔ مودودی صاحب کو ہمیشہ ہی سے اپنے علم و فضل کے متعلق بے انتہا خوش اعتمادی رہی ہے اور وہ ابتدائے عمر سے لیڈر بننے اور پس ماندہ مسلم قوم کی خدمت کرنے کا تہیہ کر چکے تھے۔ دہلی کے بعد وہ اسی خیال سے حیدر آباد تشریف لے گئے اور کئی سال تک وہاں سے ایک رسالہ نکالتے رہے اور بہت سی کتابیں بھی شائع کیں جو سب کی سب مذہبی اصلاح کے خیال سے تحریر کی گئی تھیں۔ بڑی کوششوں کے بعد پٹھان کوٹ میں آپ نے ایک دار الاسلام قائم کیا جو تقسیم ہند تک قائم رہا۔ اس کے بعد وہ اپنے رفقائے کار سمیت پاکستان تشریف لے آئے۔ اس دوران میں آپ نے ایک جماعت قائم کر لی تھی جس کا نام اسلامی جماعت ہے لیکن یہ جماعت بنانے سے پہلے مودودی صاحب اس بات کے سخت مخالف تھے کہ مذہبی لائنوں پر مذہبی نام سے کوئی جماعت بنائی جائے کیونکہ اس سے اسلام میں فرقہ بندی زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن تجربہ کے بعد آپ کو یہ رائے بدلنی پڑی۔ اس جماعت کا عقیدہ یہ ہے (گو اس کا علی الاعلان اظہار نہیں کیا جاتا) کہ اس وقت روئے زمین پر کہیں بھی کوئی ایسا مسلمان موجود نہیں جو حقیقت میں مسلمان ہو۔ کیونکہ مودودی صاحب کی رائے میں مسلمان صرف وہی ہے جو خود رسول اکرمؐ یا حضور کے صحابہ کبارؓ جیسا متقی اور متورع ہو۔ اس جماعت کے ارکان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ مودودی صاحب یا ان کے کسی خلیفہ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے بعد ہر مسلمان پکا اور سچا مسلمان بن سکتا ہے۔

جہاں تک سیاسی خیالات کا تعلق ہے۔ پہلے وہ سخت کٹر کانگریسی تھے۔ پھر الجمعیۃ کے ساتھ ساتھ کانگریس سے بھی الگ ہو گئے لیکن مسلم لیگ کے ہمیشہ مخالف رہے۔ اور اب تک سخت مخالف ہیں۔ آپ کا

قول ہے کہ مسلم لیگی سب کے سب مغربیت زدہ لوگ ہیں۔ ان کی نظر، ان کا دل، ان کے خیالات سب کے سب مغربی ہیں جن کو اسلام سے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ مسلم لیگ نے قیامِ پاکستان کے واسطے جو جہاد کیا ہے آپ اس کے بھی مخالف تھے۔ گو کہنے کو آپ نے اپنی جماعت کو یہ ہدایت کر رکھی تھی کہ اپنے آپ کو غیر جانبدار کہو لیکن جتنے "اسلامی" بھائیوں سے تبادلہ خیالات کا موقع ملا سبھی کو قیامِ پاکستان کے خلاف پایا۔ اور اس اختلاف کی وجہ صرف یہ تھی کہ وُہ لوگ جو پاکستان کی بُنیاد ڈال رہے ہیں سچے مسلمان نہیں۔ لیکن اب جو پاکستان بن گیا۔ تو مودودی صاحب اور آپ کی جماعت سب کی یہ خواہش ہے کہ اس کی حکومت اپنے ہاتھ میں لے لیں۔

مسلمان قوم کی تباہی کے ہزاروں اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی ہے کہ بہت کم مسلمانوں کو اپنی صحیح قدر و قیمت معلوم ہے۔

مودودی صاحب کو حقیقت میں اتنا بھی تو معلوم نہیں کہ آج کل حکومت کرنے کے لئے کن کن علوم میں مہارت کی ضرورت ہوتی ہے اور ان کے نام کیا کیا ہیں۔ مودودی صاحب کی پاکستان دشمنی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ آپ نے جہادِ کشمیر جیسی ضروری اور متبرک تحریک کے خلاف فتویٰ دیا۔ اور جو فقہی عذرِ لنگ پیش کیا۔ اس سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ کو فنِ حکومت کی ا۔ ب۔ ت بھی نہیں آتی چنانچہ مولانا شبیر احمد عثمانی سے خط و کتابت کرنے کے بعد آپ نے اپنی غلطی یا دوسرے الفاظ میں علمی ناواقفیت کا اقرار بھی کر لیا۔ اب قارئینِ کرام خود فیصلہ کر لیں کہ ہم پاکستانی اپنے عزیز وطن کی تقدیر ایسے لوگوں کے ہاتھ میں کس طرح دے سکتے ہیں۔ ہمارے وطنِ عزیز کی عمر ابھی صرف دو سال کی ہے۔ باہر یہ چاروں طرف دشمنوں سے گھرا ہوا ہے اور اندر ہزاروں جاسوسوں سے بھرا ہوا ہے۔

ہم مودودی صاحب اور آپ کی جماعت سے بہت عاجزانہ درخواست کرتے ہیں کہ وُہ حکومت کو ہتھیانے کی بجائے مسلمانوں کے اخلاق کی اصلاح کی کوشش کریں اور ان میں اسلامی تعلیم پھیلائیں۔ اگر وُہ ایسا کریں گے

تو ملک کو بھی فائدہ ہوگا۔ اور پبلک خود بخود ان کو حکومت کے تخت پر لا کر بٹھا دے گی۔ (محمد محترم انصاری کراچی)

اس مکتوب میں واقعات کے بیان کرنے میں ایک دو جزوی غلطیاں ہوئی ہیں لیکن یہ خط ایک ایسے بزرگ کا لکھا ہوا ہے جو مولانا کو پینتیس ۳۵ برس سے جانتے ہیں۔ انہوں نے اپنا نام اور مقام بھی دیا ہے اور اخبار جنگ نے جو عام طور پر جماعتِ اسلامی کا ہمدرد اور حامی ہے اسے شائع کیا ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر ہم نے اسے پورا نقل کر دیا لیکن مکتوب نگار کا یہ خیال کہ مولانا پہلی مرتبہ پبلک کے سامنے الجمعیۃ کے ایڈیٹر کی حیثیت سے آئے صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ اس سے کچھ عرصہ پہلے مولانا مودودی جبل پور میں ایک کانگریسی اخبار کے ایڈیٹر رہ چکے تھے۔ اس کی تصدیق بمبئی کے مشہور کانگریسی اور احراری لیڈر مسٹر علی بہادر خاں کے اخبار ہلالِ نو کے اس اقتباس میں ملتی ہے۔

"۲۸ برس قبل جب جبل پور میں مولانا مودودی کے ایک مقالہ پر "تاج" کے پرنٹر پبلشر گرفتار ہوئے تو مولانا مودودی جو "تاج" کے ایڈیٹر تھے گرفتاری سے بچنے کے لئے یکایک دہلی روانہ ہوگئے۔ اور ان کے اس فعل کی وجہ سے راقم الحروف کا مستقبل کچھ سے کچھ ہو گیا جبل پور کے قوم پرست مسلمانوں اور کانگریسی ہندوؤں نے مجھے "تاج" کی ادارت پیش کی اور میں نے قبول کر لی۔ یہاں سے میری صحافت کا دور شروع ہوتا ہے۔ نہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اس اخبار کو لاوارث چھوڑ کر یکایک جبل پور سے روانہ ہو جاتے نہ میں اس پیشہ میں قدم رکھتا۔ ان کے جیل سے بچنے کے جذبہ نے میری زندگی کو بدل ڈالا۔"

(ہلالِ نو بمبئی ۱۰ ؍ اکتوبر ۱۹۴۸ء)

مولانا مودودی کے ابتدائی ایام | مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ۲۵ ستمبر ۱۹۰۳ء کو بمقام اورنگ آباد پیدا ہوئے۔ والد ریاست حیدر آباد میں ملازم تھے۔ اور مولانا کی زندگی کے پہلے تیرہ چودہ سال اورنگ آباد میں گزرے پھر والد پنشن لیکر اپنے آبائی وطن دہلی میں آ مقیم ہوئے اور مولانا بھی یہاں آ گئے مولانا کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی گیارہ برس کی عمر میں مدرسہ فوقانیہ میں داخل ہوئے لیکن والد کی وفات پر رسمی تعلیم کا سلسلہ درہم برہم ہو گیا البتہ مشہور ہے کہ غیر رسمی طور پر آپکی علمی راہنمائی مولوی عبدالسلام

نیازی (ترکمان دروازے والوں) نے کی۔ آپ رام پور کے مشہور معقولی تھے۔ مولانا کا لڑکپن سے اس حلقے میں آنا جانا شروع ہو گیا تھا جس میں قاری سرفراز حسین خلیقی دہلوی۔ نثار دہلوی اور نیاز فتح پوری کبھی کبھی شریک ہوتے تھے۔ خلیقی اور نیاز کے زیر اثر انہوں نے طرزِ تحریر پر توجہ کی تو مولوی عبد السلام کے اثر سے ان پر منطق اور معقولات کا وُہ رنگ چڑھا جو عام طور پر علمائے دہلی کا خصوصی وصف نہیں۔ مولانا احمد سعید ناظم جمعیتہ العلمائے ہند ان میں خاص طور پر دلچسپی لیتے تھے۔ چنانچہ انہی کی سعی سے وُہ جمعیتہ العلمائے ہند کے دفتر سے وابستہ ہوئے۔

"الجہاد فی الاسلام" مولانا الجمعیتہ کے دفتری کام انجام دے رہے تھے کہ دسمبر ۱۹۲۶ء کی آخری تاریخوں میں سوامی شردھانند کو ایک مسلمان نے قتل کر دیا۔ یہ واقعہ غیر مسلموں کے لئے بہانہ بنا۔ انہوں نے تمام امتِ اسلامیہ بلکہ خود اسلامی تعلیمات کو اِس واقعہ کا ذمہ دار قرار دینا شروع کیا اور قرآنِ کریم کے خلاف اِس قسم کے الزامات عائد کرنے لگے کہ اِس کی تعلیم مسلمانوں کو خونخوار و قاتل بناتی ہے۔ اس کی تعلیم امن و امان اور مسالمت کے خلاف ہے! اور اس کی تعلیم نے مسلمانوں کو اتنا متعصب بنا دیا ہے کہ وُہ ہر کافر کو گردن زدنی سمجھتے ہیں۔" مولانا نے ان خیالات کی تردید کے لئے الجمعیتہ میں ایک سلسلہ مضامین لکھنا شروع کیا۔ ۲۲-۲۳ نمبروں کی اشاعت کے بعد طوالت کے خیال سے اسے موقوف کر دیا۔ مگر الجہاد فی الاسلام کے نام سے کوئی پانچ سو صفحے کی ایک مبسوط کتاب لکھی۔ اِس میں احکامِ جہاد کی تفصیل و توضیح کے علاوہ دُوسرے مذاہب (مثلاً مسیحیت اور ہندو مت) کے قوانینِ جنگ کا اِسلامی طریقِ کار سے موازنہ بھی کیا۔

قیامِ حیدر آباد الجہاد فی الاسلام نے پہلی مرتبہ مولانا کو علمی دنیا میں روشناس کیا۔ لیکن ان دنوں الجمعیتہ کی مالی حالت خراب تھی۔ مولانا کو اس سے ترکِ تعلق کرنا پڑا۔ چنانچہ ۱۹۲۹ء میں وُہ جمعیت العلمائے ہند سے علیحدہ ہو گئے اور دہلی چھوڑ کر حیدر آباد میں اقامت اختیار کی۔ وہاں ان کے بھائی سید ابو الخیر مودودی دارالترجمہ سے وابستہ تھے۔ مولانا نے بھی اسی زمانے میں کسی پبلشر کے لئے تاریخ حکومتِ آصفیہ لکھی جو شائع

ہو چکی ہے لیکن قیامِ حیدر آباد میں ان کا اہم کام ترجمان القرآن کی ادارت تھا جو ۱۹۳۲ء میں جاری ہوا۔ شروع میں یہ رسالہ مولوی ابو محمد مصلح (صاحب عالمگیر تحریک قرآنی) کا ترجمان تھا لیکن آہستہ آہستہ مولٰنا نے اس میں بڑی وسعت پیدا کی۔ اور اسے ایک امتیازی شان دے دی۔

مولانا مودودی کی ایک قلمی تصویر مولٰنا مودودی کوئی آٹھ نو برس حیدر آباد میں مقیم رہے۔ ان کے قیامِ حیدر آباد کے آخری ایام کی قلمی تصویر مولوی رئیس احمد جعفری کی کتاب دید و شنید میں ملتی ہے فرماتے ہیں :-

"مولٰنا مودودی ابو الاعلیٰ

آغاز میں ہم کیا تھے، انجام میں ہم کیا ہیں

۱۹۳۷ء کی ایک سرد شام کو خلافت ہاؤس کے مہمان خانے میں ایک نئی صورت نظر آئی۔ میانہ قد، دوہرا بدن، سر پر ترکی ٹوپی۔ علی گڑھ کٹ پائجامہ حیدر آبادی وضع کی شیروانی۔ ڈاڑھی ندارد۔ غالباً مونچھیں بھی منڈی ہوئیں۔ انگریزی تراش کے بال۔ خوبصورت چہرہ۔ بڑی بڑی آنکھیں۔ کچھ خاموش خاموش۔ کچھ الگ تھلگ سے۔ میں نے مولانا عرفان سے پوچھا آپ کی تعریف؟ فرمایا۔ ابو الاعلیٰ مودودی۔

اس نام کا مسمّٰی آنکھوں کے لئے نیا تھا لیکن کانوں کے لئے نیا نہ تھا۔ بچپن سے مولٰنا ابو الاعلیٰ کے افکارِ دماغی، زورِ قلم اور متوازن رائے کا سکہ دل پر بیٹھا ہوا تھا۔ یہ وہی صحافی تھا جس نے اپنی نوجوانی کے زمانہ میں جمعیۃ العلمائے ہند کے ترجمان "الجمعیۃ" کی عنانِ ادارت ہاتھ میں لی اور اسے ہندوستان کے بلند پایہ اخبارات کی صفِ اوّل میں پہنچا دیا۔ سوامی شردھانند کے حادثۂ قتل کے بعد جس نے "اسلام اور تشدّد کا مسلک" کے موضوع پر اس قدر عالمانہ سیر حاصل اور بلند پایہ مقالات لکھے کہ دھوم مچ گئی۔ مخالفین تک داد دینے پر مجبور ہو گئے۔ اور اب عرصہ سے جس کی ادارت میں حیدر آباد سے رسالہ "ترجمان القرآن" نکل رہا تھا۔ جس کے مقالات اپنے وزن اور معلومات کے اعتبار سے ہندوستان کے بڑے بڑے اربابِ نظر اور اہل علم کے لئے باعثِ فخر و رشک تھے۔ باتیں کیں تو معلوم ہوا خدا نے ذہانت کے ساتھ ساتھ حلم۔ گہرائی اور فکر کی نعمت

بھی عطا کی ہے۔ ابھی تک مولانا بڑے آدمی نہیں بنے تھے۔ دُنیا سے بے نیاز بھی نہیں ہوئے تھے۔
ساحل ممبئی پر حیدر آباد کے ایک حاکم با اختیار تک ، جو ولایت سے آرہا تھا اپنے ایک عزیز کی سفارش پہنچانے تشریف لائے تھے لیکن باتوں میں ، لب و لہجے میں بڑا پن پوری شان کے ساتھ موجود تھا۔ بے موقع تبسم سے گریز، مختصر اور دو ٹوک باتیں ، خلا ملا سے پرہیز ، تخلیہ اور تجلیہ میں یکساں سنجیدگی ، اور خاموشی ، بڑے آدمیوں کے یہی اسلحہ ہوتے ہیں ۔ اور مولانا ان سے پورے طور پر مسلح تھے "

مولانا کے لئے یہ زمانہ ایک عمیق ذہنی کشمکش کا دور تھا ۔ ایک تو وہ ان دنوں ویسے ہی "پراگندہ روزی پراگندہ دل" رہتے تھے لیکن تحریک خلافت کی ناکامی بھی ان کے لئے ذہنی کشمکش کا سامان پیدا کر چکی تھی اس تحریک کی بدولت علماء کی قوت اور اہمیت کو چار چاند لگ گئے تھے جمعیۃ العلمائے ہند کی تشکیل بھی انہی دنوں ہوئی لیکن اس تحریک کی ناکامی اور ہندوستان کے اندرونی مسائل کی روز افزوں اہمیت سے پھر وہ طبقہ برسر اقتدار آگیا جس نے سرسید کے وقت سے اپنی مساعی مسلمانان ہند کے حقوق و مستقبل کے لئے وقف کر رکھی تھیں اور جس طبقے میں علما کو نمایاں جگہ حاصل نہ تھی ۔ مولانا ان نامساعد حالات کی بنا پر سخت پریشانی کی حالت میں تھے کہ جانب شمال سے روشنی کی شعاع نمودار ہوئی جو مولانا کے لئے شب تاریک کے بعد صبح صادق کا پیغام لے کر آئی ۔ اس زمانہ میں مولوی نیاز علی صاحب نے پٹھان کوٹ کے قریب دار الاسلام قائم کیا اور جن حضرات کو وہاں کام کرنے کی دعوت دی ۔ ان میں مولانا مودودی بھی تھے ۔

اسلامی جماعت کا آغاز ۱۹۳۸ء کی ابتدا تھی کہ مولانا مودودی حیدر آباد دکن سے پٹھان کوٹ تشریف لائے اور یہاں کام کا آغاز کیا ۔ مگر ان کے اور مولوی نیاز علی صاحب کے درمیان کچھ اختلافات پیدا ہوئے ۔ چنانچہ کچھ عرصہ کے لئے مولانا لاہور تشریف لے گئے ۔ وہاں ۱۹۳۹ء میں تقریباً ایک سال تک اسلامیہ کالج لاہور میں صیغہ دینیات کے ناظم رہے ۔ لیکن پھر پٹھان کوٹ تشریف لے گئے جو قیام پاکستان سے پہلے اسلامی جماعت کا مرکز تھا ۔

اسلامی جماعت کی بنیاد ۲۶ اگست ۱۹۴۱ء کو لاہور میں رکھی گئی۔ پہلے جلسے میں کل پچھتر علماء اور ہمدرد شامل ہوئے۔ مولانا مودودی امیر جماعت منتخب ہوئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی اجلاس کے بعد ہی جماعت میں اختلافات رُونما ہو گئے۔ اور ذیل کے چار اصحاب نے مولانا مودودی کی ذات اور کام پر تحریری اعتراضات کئے۔ بعد پھر جماعت سے علیحدہ ہو گئے۔

۱۔ مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدیر الفرقان بریلی

۲۔ مولانا سید محمد جعفر صاحب خطیب مسجد جامع کپورتھلہ

۳۔ قمرالدین خاں صاحب سابق ناظم جماعت

۴۔ عطاء اللہ صاحب پیو اکھالی بنگال

لیکن ان حضرات کی علیحدگی سے جماعت کا کام رکا نہیں بلکہ روز بروز ترقی کرتا گیا۔ ۱۹۴۳ء میں مولانا امین احسن اصلاحی جماعت میں شامل ہوئے۔ اس سال ارکان کی تعداد سات سو پچاس تک پہنچ گئی تھی۔ لیکن اس میں کانٹ چھانٹ ہوئی اور جو ارکان غیر معمولی جذبۂ جوش و خروش سے عاری تھے وہ رکنیت سے محروم اور جماعت سے باہر کئے گئے۔ ارکان کی مجموعی تعداد چار سو پچاس سے بھی کم ہو گئی۔ لیکن مخلص اور محنتی اراکین کی مدد سے اور مولانا مودودی کی قابلانہ قیادت کے زیرِ اثر جماعت میں اضافہ ہوتا گیا۔ بالآخر ۱۹۴۶ء میں اسلامی جماعت نے محسوس کیا کہ پٹھان کوٹ سے زیادہ مرکزی مقام پر اسلامی جماعت کا مرکز ہونا چاہیئے۔ چنانچہ جالندھر کے قریب بستی میں کام کا آغاز ہوا۔ لیکن یہ سب منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا قتل عام ہوا۔ اور جماعت کو اگست ۱۹۴۷ء کے آخر میں پاکستان میں پناہ لینی پڑی۔

جماعتِ اسلامی نے تھوڑے ہی عرصے میں نقطۂ پراپاگنڈہ کے زور پر جو ترقی کی اور لوگوں میں رسوخ پیدا کیا وہ قابلِ داد ہے۔ بلاشبہ لیگ کا اثر اس سے کہیں زیادہ تھا اور ہے لیکن لیگ چالیس سال سے

میدان میں سے ہے۔ محسن الملک وقار الملک ۔مولانا محمد علیؒ ۔علامہ اقبالؒ ۔قائداعظمؒ جیسی ہستیوں کے ہاتھوں میں پلی، پروان چڑھی۔ قیامِ پاکستان سے پہلے مسلمانوں کے حقوق کے لئے لڑنے والی یہی ایک جماعت تھی اس نے مسلمانوں کو سرکاری ملازمتیں دلوائیں، کونسلوں میں ان کی شرکت کا حق قائم کیا۔ سندھ کو علیحدہ صوبہ بنوایا۔ سرحد کی اصلاحات کے لئے جدوجہد کی اور انجام کار مسلمانوں کو پاکستان دلایا۔ ان کارناموں کو دیکھ کر لوگ اس کے قائل ہوں تو چنداں محلِ حیرت نہیں لیکن اسلامی جماعت کے عملی کارنامے بہت مختصر ہیں۔ فقط اس کی دعوت کی دل آویزی اور منتظمین کی کارکردگی اور اخلاص نے اسے موجودہ مقام پر پہنچا دیا۔

مولانا مودودی کا ابتدائی مسلک لیکن جہاں جماعت اسلامی نے حیرت انگیز ترقی کی وہاں امیر جماعت مولانا مودودی میں ایک طرح کا ذہنی جمود بلکہ تنزل رونما ہوا۔ جماعت کے قیام سے پہلے ان کا بطور ایک مفکر اور متکلم کے خاص مقام تھا اور ایک خاص اندازِ فکر تھا۔ علما کے جمود سے انہیں اسی طرح تنفر اور وحشت تھی جس طرح بعض تعلیم یافتہ لوگوں کی بے راہروی دیکھ کر ۱۹۳۷ء میں مولانا مودودی کا دعوٰے تھا کہ ہماری تحریک ارتجاعی (REACTIONARY) نہیں۔ آگے چلنے والی ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ ہماری نسبت یہ خیال نہ کیا جائے کہ دنیا اس وقت تمدن کے جس مرتبہ پر ہے ہم اس سے رجعت کر کے اس تمدنی مرتبہ پر واپس جانے کے خواہشمند ہیں۔ جو عرب میں ساڑھے تیرہ سو برس پہلے تھا[۱]۔ ان کا قول تھا۔ "اسلام کی یہ تعلیم ہرگز نہیں ہے کہ ہم جیتے جاگتے آثارِ قدیمہ بن کر رہیں۔ اور اپنی زندگی کو قدیم تمدن کا ایک تاریخی ڈراما بنائے رکھیں۔ وہ ہم کو قالب نہیں۔ بلکہ روح دیتا ہے۔ اور چاہتا ہے کہ زمان و مکان کے تغیرات سے زندگی کے جتنے بھی مختلف قالب قیامت تک پیدا ہوں۔ ان سب میں یہی روح بھرتے جائیں[۲]"۔ مغربی علوم و فنون کی نسبت بھی انہوں نے اس سے پیشتر فرمایا تھا "مغربی علوم و فنون بجائے خود سب کے سب مفید ہیں اور اسلام کو ان میں سے کسی کے ساتھ دشمنی نہیں بلکہ ایجاباً میں یہ کہوں گا کہ جہاں تک حقائقِ علمیہ

۱۔ ترجمان القرآن دسمبر ۱۹۳۷ء ۲۔ ترجمان القرآن دسمبر ۱۹۳۷ء

کا تعلق ہے اسلام ان کا دوست ہے اور وہ اسلام کے دوست ہیں[1]۔

اپنے طریقِ کار کی نسبت انہوں نے ۱۹۳۶ء میں لکھا تھا۔

"مجھے گروہِ علما میں شامل ہونے کا شرف حاصل نہیں ہے۔ میں ایک بیچ کی راس کا آدمی ہوں جس نے جدید اور قدیم دونوں طریقہائے تعلیم سے کچھ کچھ حصّہ پایا ہے اور دونوں کوچوں کو چل پھر کر دیکھا ہے۔ اپنی بصیرت کی بنا پر نہ تو میں قدیم گروہ کو سراپا خیر سمجھتا ہوں اور نہ جدید گروہ کو"

(ترجمان القرآن ص۲۲۷ ربیع الاول ۱۳۵۵ھ)

انہیں اس امر کا احساس تھا کہ مسلمانانِ ترکی کو مذہب سے برگشتہ کرنے میں علما کی قدامت پسندی کو بڑا دخل تھا۔ تنقیحات میں فرماتے ہیں:۔

"ایک طرف ترکی قوم میں اتنے بڑے انقلاب کی ابتدا ہو رہی تھی۔ دوسری طرف ترکوں کے علمائ اور مشائخ نے جواب بھی ساتویں صدی کی فضا سے نکلنے پر آمادہ نہ تھے ان کے جمود، ان کی تاریک خیالی، ان کی رجعت پسندی اور زمانہ کے ساتھ حرکت کرنے سے ان کے قطعی انکار کا اب بھی وہی حال تھا جو سلطان سلیم کے زمانہ میں تھا۔ وہ اب بھی کہہ رہے تھے کہ چوتھی صدی کے بعد اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا .... وہ ابھی تک اصرار کر رہے تھے کہ ترکی قوم میں وہی فقہی قوانین نافذ کیے جائیں گے جو شامی اور کنز الدقائق میں لکھے ہوئے ہیں"۔ (تنقیحات ص۸۱)

ترکی میں علما اور نوجوان ترکوں کے درمیان جو کشمکش پیدا ہوئی اس کے متعلق مولانا مودودی کا فیصلہ تھا:۔

"پرانے مذہبی خیال کے لوگ نوجوان ترکوں پر کفر اور فسق کے فتوے لگاتے ہیں مگر ان کو خبر نہیں کہ نوجوان ترکوں سے زیادہ گنہگار تو ترکی کے علما اور مشائخ ہیں"۔ (تنقیحات ص۸۳)

---

[1] ترجمان القرآن ستمبر ۱۹۳۶ء

مولانا مودودی نہیں چاہتے تھے کہ اس برِّ اعظم کے علماء وہی غلطی کریں جو ترکی کے علماء نے کی تھی وہ ترجمان القرآن میں ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:۔

"میں اس بات کا بھی سخت مخالف ہوں کہ علماء کرام وقت کے رُجحانات سے مُنہ موڑ کر بیٹھ جائیں۔ اور اس امر کو بھول جائیں۔ کہ وُہ ہدایہ اور بدائع کے زمانہ تصنیف میں نہیں، بلکہ نت نئی سائنٹی فک ایجادات اور تیز رفتار تمدنی انقلابات کے دَور میں رہتے ہیں۔ اِس دَور میں روز روز نئے مسائل کا پیدا ہونا لابُد ہے اور ان مسائل کو ہدایہ و بدائع کی روشنی میں حل کرنے کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں جس کا خطرہ نوجوان سائل نے اپنے استفسار میں ظاہر کیا ہے۔ رہنمائی کے لئے علماءِ اسلام میں وسعتِ نظر اور رُوحِ اجتہاد کی ضرورت ہے۔ قدم قدم پر عالمگیری اور تاتار خانی کو لاکر سدِّ راہ بنانے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ نئے زمانہ کا مسلمان قرآن و حدیث کو پیچھے چھوڑ کر جدھر منہ اُٹھے گا چل نکلے گا جس طرح ترک اور ایرانی چل نکلے" (ترجمان القرآن اگست ۱۹۳۸ء)

مولانا مودودی علماء کے ہاتھ میں قوم کی زمامِ امامت دیکھنا چاہتے تھے لیکن انہیں اس کا احساس تھا کہ یہ مقصد اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ علماء اپنے نقطہ نظر میں وسعت و تبدیلی پیدا کریں۔ مولانا ترجمان القرآن میں فرماتے ہیں:۔

"امامت خواہ وُہ آگ کی طرف لے جانے والی ہو یا جنّت کی طرف، بہر حال اس گروہ کا حصّہ ہے جو سمع و بصر و فواد کو تمام اِنسانی گروہوں سے بڑھ کر استعمال کرے۔ یہ انسان کے حق میں اللہ کا بنایا ہوا اٹل ضابطہ ہے اور اس میں کوئی رُو رعایت نہیں ہے۔ خواہ کوئی گروہ خدا شناس ہو یا خدا ناشناس۔ بہرحال جو یہ شرط پُوری کرے گا دنیا کا امام بن جائے گا اور جو نہ کرے گا تو مقتدی ہی نہیں بلکہ اکثر حالات میں مطیع بھی بننے سے نہ بچ سکے گا۔ آپ کو جس چیز نے امامت کے منصب سے ہٹایا اور خدا ناشناس اہلِ مغرب کو لا بٹھایا وہ دراصل یہی ضابطہ تھا۔ آپ کے ہاں مدت ہائے دراز سے علم کی جو حالت تھی اس

میں بصر اور فواد دونوں معطل تھے اور سمع کا کام بھی صرف پہلے کی حاصل شدہ معلومات فراہم کرنے تک محدود تھا۔ بخلاف اس کے ناخدا شناس یورپ علم کے میدان میں آگے بڑھا اور امام بن گیا اور آپ مقتدی بن کر رہ گئے۔ آپ کی دینی تعلیم کے تمام مراکز ابھی تک اپنی اسی غلطی پر اڑے ہوئے ہیں جس نے آپ کو اس درجہ پر پہنچایا ہے۔"

قرآن و سنّت کی بھی جن اصولوں پر وُہ تعلیم دینا چاہتے تھے وُہ قدیم کی نسبت جدید سے زیادہ قریب تھے تفہیمات میں فرماتے ہیں:۔

"علوم اسلامیہ کو بھی ان کی قدیم کتابوں سے جوں کا توں نہ لیجئے بلکہ ان میں سے متاخرین کی آمیزشوں کو الگ کر کے اسلام کے دائمی اُصول اور حقیقی اعتقادات اور غیر متبدل قوانین لیجئے...... قرآن اور سنّت کی تعلیم سب پر مقدم ہے۔ مگر تفسیر و حدیث کے پُرانے ذخیروں سے نہیں"۔ (ص ۱۳۳)

اور تو اور کتب حدیث کے متعلق انہوں نے ایسے خیالات کا اظہار کیا کہ اگر آج کسی اور کے قلم سے ان کا بیان ہو۔ تو اسے منکرین حدیث میں سے شمار کیا جائے تفہیمات میں فرماتے ہیں:۔

"محدثین نے اسماء الرجال کا عظیم الشان ذخیرہ فراہم کیا ہے جو بلا شبہ بیش قیمت ہے مگر ان میں ایسی کونسی چیز ہے جس میں غلطی کا احتمال نہ ہو"۔ (ص ۲۹۲)

تفسیر کے متعلق بھی ان کا طریق کار قدیم کی نسبت جدید سے زیادہ ملتا جلتا تھا انہوں نے اپنی تفسیر میں پرانے مفسرین سے استفادہ نہیں کیا۔ اپنے تاثرات کو لکھا گیا ہے۔ خود تفسیر کی ابتدا میں فرماتے ہیں:۔

"اس میں جس چیز کی کوشش میں نے کی ہے وُہ یہ ہے۔ کہ قرآن کو پڑھ کر جو مفہوم میری سمجھ میں آئے اور جو اثر میرے قلب پر پڑتا ہے اسے جوں کا توں اپنی زبان میں منتقل کر دوں"

علم تفسیر کے متعلق تفہیمات میں آپ نے فرمایا تھا کہ قرآن کے لئے کسی تفسیر کی حاجت نہیں۔ ایک اعلیٰ درجے کا پروفیسر کافی ہے۔ (ص ۲۲۲)

جدید متکلمین کا خیال ہے کہ قدمائے عبادات اور اعتقادات پر زیادہ زور دیا تھا اور اعمال اور خدمتِ خلق پر کم۔ حالانکہ کلام مجید کا نقطۂ نظر اس معاملے میں کچھ اور ہے۔ مولانا مودودی کی قدیم تصانیف سے خیال ہوتا ہے۔ کہ اس معاملے میں بھی ان کا نقطۂ نظر جدید یہ سے قریب تر تھا۔ خطبات (حصہ سوم) میں فرماتے ہیں :۔

" آپ سمجھتے ہیں کہ ہاتھ باندھ کر قبلہ رُو کھڑے ہونا، گھٹنوں پر ہاتھ ٹیکنا۔ زمین پر ہاتھ ٹیک کر سجدہ کرنا اور چند مقرر الفاظ زبان سے ادا کرنا بس یہی چند افعال اور حرکات بجائے خود عبادت ہیں۔ آپ سمجھتے ہیں کہ رمضان کی پہلی تاریخ سے شوال کا چاند نکلنے تک روزانہ صبح سے شام تک بھوکے پیاسے رہنے کا نام عبادت ہے۔ آپ سمجھتے ہیں کہ قرآن کے چند رکوع زبان سے پڑھ دینے کا نام عبادت ہے۔ غرض آپ نے چند افعال کی ظاہری شکلوں کا نام عبادت رکھ چھوڑا ہے۔ لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے جس عبادت کے لئے آپ کو پیدا کیا ہے۔ اور جس کا آپ کو حکم دیا ہے وُہ کچھ اور ہی چیز ہے وُہ عبادت یہ ہے کہ آپ اپنی زندگی میں ہر وقت، ہر حال میں، خدا کے قانون کی اطاعت کریں اور ہر اس قانون کی پابندی سے آزاد ہو جائیں جو قانون الٰہی کے خلاف ہو" (خطبات حصہ سوم صٓ۱)

ایک اور جگہ فرماتے ہیں :۔

" آپ پُوچھیں گے کہ یہ نماز روزہ اور حج وغیرہ کیا چیزیں ہیں۔ اِس کا جواب یہ ہے کہ دراصل یہ عبادتیں جو اللہ نے آپ پر فرض کی ہیں۔ ان کا مقصد اس بڑی عبادت کے لئے تیار کرنا ہے جو آپ کو زندگی میں ہر وقت ہر حال میں ادا کرنی چاہیئے۔ (خطبات حصّہ سوم صٓ۱۲)

اِسلامی شریعت کی عام ترجمانی کی نسبت وُہ فرماتے ہیں :۔

" دوسرا بنیادی نقص اس مسخ شدہ مذہبیت میں یہ ہے کہ اس میں اسلامی شریعت کو ایک منجمد شاستر بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ اس میں صدیوں سے اجتہاد کا دروازہ بند ہے جس کی وجہ سے اسلام ایک زندہ تحریک کی بجائے عہدِ گذشتہ کی تاریخ بن کر رہ گیا ہے"۔ (ترجمان القرآن جلد ۱۸۔ عدد ۱)

آگے چل کر فرمایا ہے "اسلام کی تعلیم دینے والی درسگاہیں آثارِ قدیمہ کے محافظ خانوں میں تبدیل ہو گئی ہیں"

اور آگے ملاحظہ فرمایئے:۔

"تیسرا اہم نقص اس میں یہ ہے کہ جزئیات کی ناپ تول مقداروں کے غیر منصوص تعین اور روح سے بڑھ کر ظاہر پر دار دینداری رکھنے کی بیماری اس میں حد سے بڑھ گئی ہے۔ وہ غیروں کی تالیف تو کیا کرے گی الٹی اپنوں کی تنفیر کا سبب بن رہی ہے"

مولانا مودودی کے خیالات میں انقلاب سنہ ۱۹۳۸-۳۹ء کے بعد مولانا کے خیالات میں ایسا انقلاب عظیم آیا کہ پھر انہوں نے اسلام کی جس صورت پر زور دیا اس میں "روح" نہ تھی صرف "قالب" ہی "قالب" تھا۔ اب جس تمدن کو وہ رواج دینا چاہتے تھے وہ وہی تھا جو عرب میں ساڑھے تیرہ سو برس پہلے تھا" اور مغربی علوم و فنون کے لئے کلمہ خیر تو ان کی تازہ تصنیفوں اور تقریروں میں ڈھونڈے سے بھی نہ ملے گا۔

معلوم ہوتا ہے کہ خود مولانا کو بھی خدشہ تھا کہ جماعتی پابندیوں کے باعث کہیں ان کی مفکرانہ و متکلمانہ حیثیت پر آنچ نہ آجائے۔ چنانچہ انہوں نے جماعت کے پہلے جلسے میں فرمایا:۔

فقہ اور کلام کے مسائل میں میرا ایک خاص مسلک ہے جس کو میں نے اپنی ذاتی تحقیق کی بنا پر اختیار کیا ہے اور پچھلے آٹھ سال کے دوران میں جو اصحاب "ترجمان القرآن" کا مطالعہ کرتے رہے ہیں وہ اس کو جانتے ہیں۔ اب کہ میری حیثیت اس جماعت کے امیر کی ہو گئی۔ میرے لئے یہ بات صاف کر دینی ضروری ہے کہ فقہ و کلام کے مسائل میں جو کچھ میں نے پہلے لکھا ہے اور جو کچھ آئندہ لکھوں گا یا کہوں گا اس کی حیثیت امیر جماعت اسلامی کے فیصلہ کی نہ ہو گی بلکہ میری ذاتی رائے کی ہو گی۔ میں نہ تو یہ چاہتا ہوں کہ ان مسائل میں اپنی رائے کو جماعت کے دوسرے اہلِ علم و تحقیق پر مسلط کروں اور نہ اس کو پسند کرتا ہوں کہ جماعت کی طرف سے مجھ پر ایسی کوئی پابندی عائد ہو کہ مجھ سے علمی تحقیق اور اظہارِ رائے کی آزادی سلب ہو جائے"

مولانا کی علمی تحقیق اور آزادی رائے پر جماعت نے کوئی پابندی نہ لگائی۔ لیکن اب وُہ جس ماحول میں رہنے لگے اور جو جماعتی نصب العین انہوں نے سامنے رکھا اس کا غیر محسوس اثر ان کے خیالات پر ناگزیر تھا۔ مولانا کے رفقائے کار بڑے محنتی۔ مخلص اور پُرجوش ہیں۔ لیکن ذہنی اعتبار سے ان میں سے ایک بھی مولانا کی ٹکر کا نہیں اور نہ صرف وُہ علمی اور ذہنی حیثیت سے مولانا کی سطح سے بہت نیچے ہیں بلکہ انہیں تو ان مسائل کا سرے سے احساس ہی نہیں جن کا حل اس زمانے میں ضروری ہے۔ مسائل حاضرہ اور قدیم و جدید کے توازن کی نسبت کبھی بھی ان کا وُہ نقطۂ نظر نہ تھا جو ۳۸-۱۹۳۷ء سے پہلے مولانا کا تھا۔ اس کے علاوہ انتہا پسندی۔ ضد اور تحقیرِ مخالفین میں وُہ مولانا سے بہت آگے ہیں [۱]۔

ان حضرات کے اثرِ صحبت کے علاوہ جماعتی نصب العین کا شعوری اور غیر شعوری اثر بھی مولانا پر ہُوا اور شاید اس اتفاق نے کہ جماعت کی تشکیل کی مخالفت فقط علما کی طرف سے ہوئی جماعت کو علما کے زاویۂ نگاہ کے متعلق زیادہ محتاط کر دیا۔ ان سب اسباب (یا کسی اندرونی، ذہنی انقلاب) نے مولانا کے خیالات پر ایسا اثر ڈالا کہ اب وُہ اپنے ابتدائی نقطۂ نظر سے ہٹ کر کہیں سے کہیں جا پہنچے۔

---

[۱] مولانا عبدالماجد دریا بادی کے اخبار صدقِ جدید (۱۶ نومبر ۱۹۵۱ء) میں مولانا مودودی کی نسبت "ان کے ایک پاکستانی مخلص" کا مراسلہ شائع ہُوا تھا۔ جو اگر مولوی نیاز علی بانی دارالاسلام پٹھان کوٹ کا نہیں۔ تو (دارالاسلام کے) کسی ایسے بزرگ کی تحریر ہے جنہیں پنجاب میں مولانا مودودی سے "تعلقات کی اوّلیت" حاصل ہے اور جن کے مولانا مودودی کے ساتھ (دارالاسلام میں" طویل قیام کے باعث" "خانگی تعلقات" ہیں۔ وُہ مولانا مودودی کی نسبت لکھتے ہیں: "ان کی تحریک کا اس ملک کی اصلاح میں خیر کا پہلو بہت زیادہ ہے یعنی لوگوں کو اس سے بہت فائدہ ہُوا۔ ہاں ان کے طریقِ کار اور خاص سلبی کیفیت (نفرت اور حقارت) نے ان کو یعنی ان کی تحریک کو بہت نقصان پہنچایا...... زیادہ خرابی تو مولانا کے بعض رفقا، نعیم صدیقی اور نصراللہ خاں عزیز صاحب کے قلم کی زہر چکانی نے پھیلائی ہے۔ اصلاحی صاحب کو بھی اپنے علم و فضل کا بہت زعم ہے۔ اس لئے یہ لوگ ہر قسم کی ٹکر لینے کو تیار ہیں"۔ (ص۸)

مولانا کے خیالات میں جو تغیر و تبدل ہوا اور جو طریق کار انہوں نے بالآخر اختیار کیا۔ اس نے ان کے خیالات کی عام مقبولیت میں بڑی مدد دی۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب کوئی مفکر گوشۂ غور و فکر سے نکل کر جماعتی تنظیم کی منزل میں قدم رکھتا ہے تو اسے اس طرح کا تغیر و تبدل گوارا کرنا ہی پڑتا ہے۔ لیکن راقم السطور اور مولانا کے علم و فضل کے بعض مداحوں کا خیال ہے کہ نہ صرف اصول اور قومی مفاد کے نقطۂ نظر سے مولانا کا ابتدائی مسلک زیادہ صحیح تھا بلکہ پاکستان (اور جدید ہندوستان) کے حالات کچھ ایسے ہیں کہ جماعتی نقطۂ نظر سے بھی (اگر اسلامی جماعت کو حزبِ مخالف کی حیثیت سے آگے بڑھنا ہے) وہی مسلک زیادہ مفید رہتا۔[1]

مولانا کے سیاسی معتقدات | مولانا مودودی کو شروع سے سیاسیات سے گہری دلچسپی رہی ہے۔ ان کی زندگی کا آغاز بطور جرنلسٹ ہوا۔ جمعیۃ العلماء ہند جس کے دامن سے وہ وابستہ ہوئے بظاہر نیم مذہبی نیم سیاسی

---

[1] مولانا کے خیالات میں جو تبدیلیاں ہوئیں، ان کی ایک دلچسپ مثال مسئلۂ تصویر کشی کے متعلق ملتی ہے۔ مولانا نے دسمبر ۱۹۳۷ء کے ترجمان القرآن میں لکھا تھا "سینما ناپاک نہیں ہے۔ ناپاک دراصل وہ تہذیب ہے جو خدا کی پیدا کی ہوئی اس طاقت سے فحش اور بے حیائی کی اشاعت کا کام لیتی ہے۔" یعنی اگر سینما سے فحش اور بے حیائی کی اشاعت کا کام نہ لیا جائے تو سینما کی چلتی پھرتی تصویریں قابلِ اعتراض نہیں لیکن اب عام تصویروں کے متعلق بھی جماعت کا جو نظریہ ہے اسے مولانا مسعود عالم کے الفاظ میں پڑھیے جو علمائے عرب سے اپنی بحثوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "ڈاڑھی کی حد تک تو یہاں معقول لوگ سمجھتے ہیں۔ یہ سنّت اور شعار ہے اور اس کا رکھنا اچھا ہے لیکن فوٹو کی حرمت لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔ سید رشید رضا اور محمد عبدہ کے بعد ہمارے جیسے طالب علموں کی بات کیوں سنیں گے بہر حال یہاں لوگ کچھ بھی سمجھیں ان کی خاطر یا ملائیت کے الزام کے خوف سے ہم اپنا مسلک بدلنے کے نہیں۔ (دیارِ عرب میں ص ۲۳) ـــــ خود مولانا مودودی ترجمان القرآن بابت رجب و شعبان ۱۳۶۲ھ میں فرماتے ہیں: "فوٹو گرافی اور مصوّری میں کوئی فرق نہیں کیا جا سکتا۔ اور ممانعت چونکہ جاندار اشیا کی ہے اس لئے تمام تصویریں حرام ہی ہوں گی۔ خواہ وہ فحش ہوں یا غیر فحش۔"

مگر اصل میں پورا سیاسی ادارہ تھا حیدرآباد میں مذہبی رنگ ان پر زیادہ چڑھا لیکن سیاسی خیالات اور عزائم فراموش نہ ہوئے۔ شروع شروع میں ترجمان القرآن میں زیادہ تر فکری اور مذہبی مضامین شائع ہوتے تھے لیکن ۱۹۳۷ء میں انہوں نے اس میں اسلامی ہندوستان کے متعلق چند سیاسی مضامین لکھے جو بعد میں مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ اوّل کے عنوان سے مدوّن ہوئے۔ مولانا نے اس عنوان پر مختلف موقعوں پر تین مختلف رسالے لکھے اور چونکہ ان تینوں رسالوں کے موضوع ایک حد تک مختلف ہیں۔ اس لئے ہم ان کا علیحدہ علیحدہ جائزہ لیتے ہیں۔

مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش (حصہ اوّل) حصہ اول ابتدائی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اور اس میں اُن سیاسی خیالات کا اظہار ہے۔ جو مولانا کے دماغ میں ہیولے کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس حصہ میں مولانا کے نقطۂ نظر کا عمومی اور مختصر سا اظہار ہے۔ اس وقت ان کا مطمحِ نظر حسب ذیل تھا:۔

"ہمیں اس امر کی کوشش کرنی چاہیئے کہ جمہور مسلمانوں کی قیادت کا منصب نہ انگریز کے غلاموں کو حاصل ہو سکے نہ ہندو کے غلاموں کو بلکہ ایک ایسی جماعت کے قبضے میں آجائے جو ہندوستان کی کامل آزادی کے لئے دُوسری ہمسایہ قوموں کے ساتھ اشتراکِ عمل کرنے پر دل سے آمادہ ہو۔ مگر اسلامی مفاد کو کسی حال میں قربان کرنے پر آمادہ نہ ہو۔" (ص ۱۴۴)

(حصہ دوم) "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" کا پہلا حصہ ایک مختصر سا رسالہ تھا۔ تقریباً دو سال بعد مولانا نے اس سے کوئی دُگنی ضخامت کا دُوسرا رسالہ لکھا جو پہلی دفعہ دسمبر ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا۔ جب سیاسی کشمکش کا پہلا حصہ چھپ کر نکلا تو اس وقت مسلم لیگ جسدِ بے جان تھی۔ اور قائدِ اعظمؒ اس میں جان ڈالنے کی کوشش کر رہے تھے مولانا کی نظر میں وُہ بے حیثیت تھی اس لئے اُنہوں نے اس پر توجہ نہ فرمائی اور نہ اس کا خاص طور پر ذکر کیا۔ دوسرے حصہ میں بھی ان کا زورِ قلم زیادہ تر کانگریس پر صرف ہوا۔ لیکن اس حصے میں مسلم لیگ کا نام لئے بغیر اس کی قیادت پر وہی الزام تراشے اور لگائے گئے جو جمعیۃ العلمائے ہند اور کانگریسی مسلمانوں کا مسلم لیگ اور اس کے لیڈروں کی مخالفت میں عام حربہ تھے۔ اس حصے کے آخر میں مولانا فرماتے ہیں:۔

"مسلمان انتہا درجہ کے ناوان ہوں گے اگر وہ اب بھی حالات کی نزاکت کو ٹھیک ٹھیک نہ سمجھیں گے وُہ ابھی تک اِس دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں کہ ان کو یہ نمائشی جلسے اور جلوس اور کھوکھلے مظاہرے قومی ہلاکت سے بچالیں گے۔ وہ ان لوگوں کی لیڈری پر اعتماد کر رہے ہیں جن کے سامنے اپنی وزارت اور وجاہت کے سوا کوئی چیز نہیں جو اپنی قوم کے لئے اپنا بال بیکا ہونا گوارا نہیں کر سکتے۔ جو مسلمانوں کے مفاد کا نام صرف اِس لئے بلند آہنگیوں کے ساتھ لیتے ہیں کہ ایوانِ وزارت پر ان کا قبضہ رہے۔ جن کی بزدلی پر دشمنوں کو پورا پورا اعتماد ہے جنہیں چیلنج کیا جاتا ہے کہ اگر تم ہمارے ساتھ جیل میں جانے اور لاٹھیاں کھانے کو تیار ہو تو ہم تمہاری ہر بات ماننے کے لئے تیار ہیں۔ اور وُہ اِس چیلنج کو قبول کرنے کی بجائے کنی کاٹ جاتے ہیں۔ جن کا حال یہ ہے کہ یورپ میں سرکار برطانیہ کو جنگ کا خطرہ پیش آتا ہے تو یہ سب سے پہلے آگے بڑھ کر اپنی وفادارانہ خدمات پیش کرتے ہیں ایسے لیڈروں سے اگر مسلمان یہ توقع باندھے بیٹھے ہیں کہ وُہ ان کی کشتی کو بھنور سے نکال لیں گے تو میں پیشین گوئی کرتا ہوں کہ ان کی کشتی ڈوب کر رہے گی"۔ (صفحہ ۲۱۵-۲۱۶)

جہاں تک آئندہ آئین کا تعلق تھا مولانا مودودی نے اپنا نصب العین حاصل کرنے کے لئے تین مختلف خاکے پیش کئے۔ ان کے مطالعہ سے ظاہر ہے کہ جس مقام پر لیگ کا قائد پہنچا وُہ اس سے کوسوں دُور رہے۔ مسلمانوں کی علیحدہ حکومت کا خیال انہیں خواب میں بھی نظر نہ آیا۔ فیڈریشن کی مختلف صورتوں پر قانع رہے۔ پہلے خاکے میں تہذیبی خود اختیاری (CULTURAL AUTONOMY) پر زور تھا۔ اور جن چیزوں کے تحفظ کے مولانا خواہاں تھے۔ وہ حسب ذیل تھیں:-

"تعلیم، مذہبی معاملات (مثلاً عبادت گاہوں اور اوقاف کا نظم و نسق اور مذہبی احکام اپنے اپنے افراد قوم پر نافذ کرنا اور ان احکام کے خلاف ان کی سرکشی کو روکنا اور مخصوص تمدنی و معاشرتی مسائل (مثلاً نکاح، طلاق، وراثت اور قومی طرزِ معاشرت (NATIONAL SOCIAL SYSTEM) میں ہر قوم کو پوری خود اختیاری حاصل ہو اور مرکز کو اس میں دخل دینے کا حق نہ ہو"۔ (صفحہ ۲۱۰)

حصہ سوم | مولانا مودودی نے جب موجودہ سیاسی کشمکش کا پہلا اور دوسرا حصہ لکھا۔ اس وقت ایک تو مسلم لیگ کی نئی تنظیم ابتدائی حالت میں تھی۔ دوسرے مولانا جن کا نقطۂ نظر مسلم لیگ اور مسلمانوں کی سیاسی قیادت کی نسبت ہمیشہ خاص قسم کا رہا ہے) اسے حقارت سے زیادہ کسی چیز کا مستحق نہ سمجھتے تھے۔ اس لئے ان دونوں حصوں میں لیگ کے متعلق ان کے تفصیلی اور واضح خیالات نہیں ملتے۔ لیکن عین اس وقت جب مولانا یہ مضامین لکھ رہے تھے ایک مردِ مجاہد مصروفِ عمل تھا اس نے مسلم لیگ میں ایک نئی زندگی پیدا کی۔ اور قوم کو اس کے جھنڈے تلے اس طرح جمع کیا کہ وہ کسی ٹھوس اور نتیجہ خیز مقصد کے لئے اس سے پہلے کبھی جمع نہ ہوئی تھی۔ مولانا کو یہ صورت حالات بھی ناپسند تھی۔ چنانچہ انھوں نے اس کے متعلق اپنے خیالات "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" حصہ سوم کے عنوان سے ترتیب دیئے۔ یہ خیالات بعض امور میں پہلے دو حصوں کے اندراجات سے اس قدر مختلف تھے کہ مولانا نے مقدمہ میں ہی محسوس کیا کہ اس قلابازی کی وضاحت ضروری ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:-

"مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" کے عنوان سے میرے مضامین کے دو مجموعے اس سے پہلے شائع ہو چکے ہیں۔ اب اس سلسلہ کا یہ تیسرا مجموعہ شائع کیا جا رہا ہے۔ بظاہر پہلے دونوں مجموعوں سے اس تیسرے مجموعہ کا فاصلہ اتنا زیادہ ہے کہ ایک شخص بادی النظر میں یوں محسوس کرے گا کہ میں نے حصہ دوم کے بعد سے یکایک اپنی پوزیشن بدل دی ہے۔ اور خود اپنی بہت سی کہی ہوئی باتوں کی تردید کرنے لگا ہوں لیکن دراصل ان تینوں مجموعوں میں ایک نصب العین کی طرف تدریجی ارتقا ہے۔"

"پاکستانی خیال کے لوگ" | تیسرے حصے کو اسلامی جماعت کا سیاسی منشور سمجھنا چاہیئے۔ اس وقت اسلامی جماعت قائم ہو چکی تھی۔ چنانچہ اس کا دستور العمل کتاب کے آخر میں بطور منزلِ مقصود کے شامل ہے۔ کتاب میں مولانا نے جابجا مسلمانوں کی مختلف جماعتوں اور بالخصوص مسلم لیگ پر نکتہ چینی کی ہے۔ ایک مستقل باب کا عنوان بھی "پاکستانی خیال کے لوگ" ہے۔ اس میں تحریک پاکستان اور لیگی قیادت پر طرح طرح کے اعتراضات تھے۔ مثلاً جو لوگ یہ کہتے تھے کہ "مسلم اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں کی اپنی حکومت قائم ہو جائے۔ پھر کوشش کی جائے گی کہ یہ

قومی اسلامی نظامِ حکومت میں بتدریج تبدیل ہو جائے" مولانا ان کے جواب میں لکھتے ہیں:۔

"ان کا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں حاکمیت جمہور کے اصول پر خود مختار حکومت کا قیام آخرکار حاکمیت رب العالمین کے قیام میں مددگار ہو سکتا ہے۔ جیسی مسلم اکثریت اس مجوزہ پاکستان میں ہے ویسی ہی بلکہ عددی حیثیت سے بہت زیادہ زبردست اکثریت افغانستان، ایران، ٹرکی اور مصر میں موجود ہے اور وہاں اس کو وہ پاکستان حاصل ہے جس کا یہاں مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ پھر کیا وہاں مسلمانوں کی خود مختار حکومت کسی درجہ میں بھی حکومتِ الٰہیہ کے قیام میں مددگار ہے یا ہوتی نظر آتی ہے۔ مددگار ہونا تو درکنار، میں پوچھتا ہوں کیا آپ وہاں حکومت الٰہی کی تبلیغ کر کے پھانسی یا جلاوطنی سے کم کوئی سزا پانے کی امید کر سکتے ہیں۔

"اگر آپ وہاں کے حالات سے کچھ بھی واقف ہیں تو آپ اس سوال کا جواب اثبات میں دینے کی جرأت نہ کر سکیں گے۔ جب صورتِ معاملہ یہ ہے تو کیا وہ شخص نادان نہیں ہے جو اسلامی انقلاب کا نصب العین سامنے رکھ کر ایسی جمہوری حکومت کے قیام کی کوشش کرے۔ جو کافرانہ حکومت سے بڑھ چڑھ کر اس کے مقصد کی راہ میں حائل ہوگی" (صفحہ ۱۳۱-۱۳۲)

جماعت کو الیکشن ۱۹۴۵ء سے علیحدہ رہنے کی ہدایت

"مسلمان اور سیاسی کشمکش" میں جو سیاسی بحث مولانا نے کی۔ وہ ایک حد تک نظری تھی لیکن ان مباحث نے جلد ہی شدید عملی صورت اختیار کر لی ۴۵ء کے آخر میں وہ انتخابات ہوئے جن کے نتائج پر اس برِاعظم کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا اور یہ طے پانا تھا کہ برطانیہ اپنا اقتدار اکھنڈ بھارت کو سونپ جائے۔ یا یہ برِاعظم بھارت اور پاکستان میں منقسم ہو۔ اس موقعہ پر مسلمان یہ دیکھنا چاہتے تھے۔ کہ جماعتِ اسلامی کس فریق کا ساتھ دیتی ہے لیگ والوں نے امیر جماعتِ اسلامی کی مدد حاصل کرنی چاہی لیکن انہیں قائل نہ کر سکے۔ تاہم امید تھی کہ وہ اپنے پیروؤں کو اس امر کی آزادی دے دیں گے۔ کہ وہ جس طرف چاہیں ووٹ دیں، اور خیال تھا کہ ان کی اکثریت دکم ازکم اسلامی اکثریت کے علاقوں میں پاکستان کے حق میں ووٹ دے گی۔ لیکن مولانا نے بالکل نیا راستہ اختیار کیا۔ اور ایک سوال کے جواب میں (جو کوثر مورخہ

۲۸ اکتوبر ۱۹۴۵ء میں شائع ہوا انتخابات میں شرکت اور رائے دہی کو یک قلم حرام قرار دیا اور فرمایا۔

"ووٹ اور الیکشن کے معاملہ میں ہماری پوزیشن صاف صاف ذہن نشین کر لیجئے۔ پیش آمدہ انتخابات یا آئندہ آنے والے انتخابات کی اہمیت جو کچھ بھی ہو اور ان کا جیسا کچھ بھی اثر ہماری قوم یا ملک پر پڑتا ہو۔ بہر حال ایک بااصول جماعت ہونے کی حیثیت سے ہمارے لئے یہ ناممکن ہے کہ کسی وقتی مصلحت کی بناء پر ہم ان اصولوں کی قربانی گوارا کر لیں جن پر ہم ایمان لائے ہیں"۔

مولانا نے اپنے اس فیصلہ کی وجہ یہ بتائی کہ چونکہ موجودہ نظام حاکمیت جمہور پر قائم ہوا ہے۔ اور جمہور جس پارلیمنٹ یا اسمبلی کو منتخب کریں۔ یہ اس کو قانون بنانے کا غیر مشروط حق دیتا ہے"۔ اس لئے ہم اس سے اشتراک نہیں کر سکتے۔ اس فیصلہ کی بناء پر مسلم لیگ اور پاکستان کے حامیوں کو تو مسلمانوں کے ووٹوں کا ضائع جانا گوارا تھا ہی۔ ترجمان القرآن میں بھی کسی صاحب نے ایک تفصیلی مضمون میں اس فیصلہ میں ترمیم کی ضرورت واضح کی۔ اور کہا کہ اگر ممبرانِ اسمبلی کو قانون سازی کا غیر مشروط حق حاصل ہے تو اس حق کا غیر مشروط ہونا ہی اس امر کی کافی ضمانت ہے کہ یہ لوگ صحیح قانون مرتب کرنے میں آزاد ہیں۔ یعنی ان کو اختیار حاصل ہوگا کہ ایسا قانون مرتب کریں جس میں آخری سند خدا کی کتاب کو مانا جائے۔ اور قانون سازی جو کچھ بھی ہو کتابِ الٰہی کے تحت ہو۔ نہ کہ اس سے بے نیاز[1]۔ مضمون نگار نے اس اسلامی فضا کی طرف بھی اشارہ کیا جو مسلم لیگ نے پیدا کر دی تھی۔ اور یہ خیال ظاہر کیا کہ اس سے مذہبی قیادت کے مدعی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اس پر مولانا مودودی نے "موجودہ انتخابات اور جماعتِ اسلامی" کے عنوان سے ترجمان القرآن" میں ایک طول طویل مضمون لکھا اور ظاہر کیا کہ انتخابات سے علیحدگی کے دو اسباب ہیں۔ ایک وجہ تو اصولی ہے (جس کا اظہار اوپر ہو چکا ہے) دوسری عملی یعنی اس سے

---

[1] قائدِ اعظمؒ نے بھی پیر صاحب مانکی شریف کے نام ایک خط میں جو نومبر ۱۹۴۵ء میں لکھا گیا۔ بالکل اسی نقطۂ نظر کا اظہار کیا تھا۔ (ملاحظہ ہو۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی وہ تقریر جو انہوں نے قرار داد مقاصد پر مجلسِ آئین ساز میں کی تھی)

حصولِ مقصد کے لیئے کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔

پاکستان کے خلاف مولانا کا پراپگنڈا اس مضمون میں مولانا نے پاکستان اور مسلم لیگ کے متعلق بد ترین بدگمانیوں کا اظہار کیا۔ پاکستان کی نسبت وُہ فرماتے ہیں :۔

"جنت الحمقا میں رہنے والے لوگ اپنے خوابوں میں خواہ کتنے ہی سبز باغ دیکھ رہے ہوں لیکن آزاد پاکستان (اگر فی الواقع وُہ بنا بھی تو) لازماً جمہوری لادینی اسٹیٹ کے نظریہ پر بنے گا جس میں غیر مسلم اسی طرح برابر کے شریک ہوں گے جس طرح مسلمان، اور پاکستان میں ان کی تعداد اتنی کم اور ان کی نمائندگی کی طاقت اتنی کمزور نہ ہو گی کہ شریعتِ اسلامی کو حکومت کا قانون اور قرآن کو اس جمہوری نظام کا دستور بنایا جا سکے[۱]۔"

تحریکِ پاکستان کو چلانے والی جماعت مسلم لیگ کی نسبت مولانا کی رائے حسب ذیل تھی :۔

مسلم لیگ کی تحریک کے متعلق پہلی بات تو یہ سمجھ لیجیئے کہ اس کے بنیادی تصورات، اس کا نظامِ ترکیبی، اس کا مزاج، اور اس کی اسپرٹ، اس کا طریقِ کار اور اس کے مقاصد سب کچھ وہی ہیں جو قومی اور قوم پرستانہ تحریکوں کے ہوا کرتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ یہ مسلمانوں کی قومی تحریک ہے اور مسلمانوں کی ہر چیز "اسلامی" بن جایا کرتی ہے۔ اِس لئے خواہ مخواہ اسے بھی اسلامی تحریک سمجھ لیا گیا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اسلامی تحریک اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالکل ایک دوسری ہی چیز ہے جس کا کوئی شائبہ بھی مسلم لیگ کی قومی تحریک میں نہیں پایا جاتا۔ اور یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ اسلام اپنے مخصوص طریقِ کار سے جس منزل تک پہنچنا چاہتا ہے۔ اس تک آپ ایک قوم پرستانہ تحریک کے ڈھنگ اختیار کر کے پہنچ جائیں۔ ہر منزل اپنی فطرت کے لحاظ سے اپنی ہی ایک مخصوص راہ رکھتی ہے آپ اِسلام کی منزلِ مقصود کو پہنچنا چاہیں تو آپ کو اسلامی تحریک ہی کی مخصوص راہ کو سمجھنا اور اسے اختیار کرنا پڑے گا۔ قوم پرستی کے طریقے اختیار کر کے آپ قومیت کی منزلِ مقصود تک پہنچ سکتے ہیں۔ مگر یہ توقع کرنا انتہائی پراگندہ خیالی ہے کہ ان ڈھنگوں سے آپ اِسلامی منزلِ مقصود تک جا

---

[۱] ترجمان القرآن فروری ۱۹۴۶ء صفحہ ۵۴-۱۵۵

پہنچیں گے۔ اِس نکتہ کی توضیح کا یہاں موقع نہیں ہے۔ مَیں مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم" میں تفصیل کے ساتھ یہ بتا چکا ہوں کہ ایک اصولی تحریک اور ایک قوم پرستانہ تحریک میں کیا فرق ہوتا ہے۔ ضرورت ہو تو پھر اس کی تشریح کر سکتا ہوں۔ یہاں میں اشارۃً صرف اتنی بات واضح کر دینا کافی سمجھتا ہوں کہ ایک اصولی تحریک کے کارکنوں کو یہ خبر دینا کہ تمہارے لئے ایک قوم پرستانہ تحریک نے بڑے اچھے مواقع پیدا کر دیئے ہیں کسی بصیرت اور معاملہ فہمی کا ثبوت نہیں ہے۔ اس کی مثال تو بالکل ایسی ہے جیسے کسی عازم کلکتہ کو یہ خبر دی جائے۔ کہ کراچی میل کھڑا ہے۔

ان کی یہ خوش خبری کسی حد تک اگر صحیح ہو بھی سکتی تھی تو شاید اس صورت میں ہوتی جب کہ مسلمانوں کی اس قوم پرستانہ تحریک میں کم از کم ثانوی حیثیت ہی سے مذہب کا پورا زور اور اثر موجود ہوتا۔ لیکن افسوس ہے کہ یہاں اس کا بھی فقدان ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ مسلم لیگ فی الواقع مسلمانوں کو اسلام اور اس کی تہذیب اور اس کے احکام کی اطاعت سے روز بروز دُور تر لے جا رہی ہے[1]"

یہ اظہارِ خیال فروری ۱۹۴۶ء میں ہوا۔ اس کے کوئی سوا سال بعد ۱۷ر اپریل ۱۹۴۷ء کو یعنی قیامِ پاکستان سے کوئی چار مہینے پہلے ٹونک میں اسلامی جماعت کا ایک اہم جلسہ ہوا۔ اس میں بھی مولانا مودودی سے مسلم لیگ کے بارے میں سوال ہوئے۔ جن کے جواب مولانا نے دیئے۔ یہ سوال اور جواب ترجمان القرآن جلد ۳۰ عدد ۹ میں درج ہیں:۔

سوالات "(۱) یہ تسلیم ہے کہ مسلم لیگ کے پیشِ نظر جو پروگرام ہے وُہ غیر اسلامی ہے۔ لیکن اس وقت صُورتِ حال یہ ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت دین سے ناواقف ہے۔ علماء نے انہیں اسلام سمجھانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ وُہ اپنے سیاسی لیڈروں کے بتلائے ہوئے راستہ کو ہی صراطِ مستقیم اور اسلام کا صحیح راستہ سمجھ رہے ہیں۔ اور غیر مسلم قومیں ان کے وجود کو مٹانے کے لئے سفاکی و خونریزی سے کام لے رہی ہیں۔ ان

---

[1] ترجمان القرآن جلد ۲۸ عدد ۳ صہ ۱۵۸-۱۵۹

حالات میں ان کی مظلومی میں جماعت ان کا ساتھ کیوں نہ دے۔ اور غیر مسلموں سے اس مدافعانہ جنگ میں شریک کیوں نہ ہو۔

(۲) اس وقت برطانیہ ہندوستان کی حکومت ہندوستانیوں کے سپرد کر رہا ہے اور اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ ہندوؤں کا حصہ ہندوؤں کے حوالہ کیا جائے اور مسلمانوں کا حصہ مسلمانوں کے حوالہ کیا جائے اور دوسری یہ کہ پورے ملک کی باگ ڈور اکثریت یعنی ہندوؤں کے حوالے کر دی جائے۔ ظاہر ہے کہ اگر آپ نے مسلم لیگ کا ساتھ نہ دیا تو غیر مسلم اکثریت سارے ملک پر اور مسلمانوں پر مسلّط ہو جائے گی۔"

امیر جماعت :- "ان سوالوں کا واضح مطلب یہ ہے کہ موجودہ حالات میں مسلمانوں کی اس قومی تحریک کا ساتھ دیا جائے اور جب یہ حالات ختم ہو جائیں تو پھر ان کا ساتھ چھوڑ دیا جائے۔ کیونکہ اسے تو سائل صاحب خود بھی تسلیم کرتے ہیں کہ یہ تحریک غیر اسلامی ہے۔ مگر میں ان کو یقین دلاتا ہوں کہ جس قسم کے حالات دیکھ کر وہ ہم سے اس وقت یہ مطالبہ کر رہے ہیں۔ ایسے حالات کبھی ختم نہ ہوں گے۔ مسائل پر مسائل پیدا ہوتے جائیں گے اور ہر مسئلہ پہلے مسئلے سے شدید تر ہوگا اور آپ کہیں بھی لکیر نہیں کھینچ سکیں گے۔ کہ فلاں حد تک تو ہم ان قومی تحریکوں کا ساتھ دیں گے اور وہاں پہنچ کر ان کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ یہ تو ہے اس سوال کا ایک رُخ۔ دوسرا رُخ جو اس سے کہیں زیادہ قابلِ غور ہے وہ یہ ہے کہ جب آپ ایک تحریک کو خود غیر اسلامی مان رہے ہیں تو پھر کس منہ سے ایک مسلمان سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ اس کا ساتھ دیا جائے۔ جن مسائل اور مصائب کا اس قدر رونا رویا جا رہا ہے یہ مسائل اور مصائب سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتے۔ اگر مسلمان اسلام کے فی الواقع سچے نمائندے ہوتے اور اگر مسلمان اب بھی سچے مسلمان بن جائیں تو آج ہی یہ سارے مسائل ختم ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ ہندوستان کے ایک ذرا سے کونے میں پاکستان بنانے کو اپنا انتہائی مقصد بنائے ہوئے ہیں۔ لیکن اگر یہ فی الواقع خلوصِ قلب سے اسلام کی نمائندگی کے لئے کھڑے ہو جائیں۔ تو سارا ہندوستان پاکستان بن سکتا ہے۔ اور اس میں ایک لادینی جمہوریت حکومت (SECULAR DEMOCRACY) یا عوامی پارلیمنٹری حکومت (POPULAR -

GOVT (PARLIAMENTARY) نہیں بلکہ خالص خدا کی حکومت کتاب و سُنّت کے اصول پر قائم ہو سکتی ہے۔

اِسلام کی لڑائی اور قومی لڑائی ایک ساتھ نہیں لڑی جا سکتی۔ اگر لوگ اسلام اور اسلامی طریق کار کو اپنی خواہشاتِ نفس کے خلاف پاکر ان کو ترک کر دینا چاہتے ہیں تو ہیر پھیر کے راستوں سے آنے کے بجائے صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ اللہ اور رسولؐ کے کام کو چھوڑ دیئے اور ہمارے نفس کے کام میں حصّہ لیجئے۔"

آخری فقروں کی بے دردی سے قطع نظر کیجئے۔ اور یہ بات بھی نظر انداز کر دیجئے کہ مسلمانوں کی "قومی لڑائی" کو کس حد تک "نفس کے کام" کہا جا سکتا ہے لیکن اس ایک فقرہ سے مسلم لیگ اور جماعت اسلامی کے نقطۂ نظر کا فرق سمجھا جا سکتا ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ "اسلام کی لڑائی اور قومی لڑائی ایک ساتھ نہیں لڑی جا سکتی"۔ مسلم لیگ کا خیال ہے کہ اسلام اور اسلامی قومیت ایک دُوسرے کی ضد نہیں، دونوں کے تقاضے پورا کرنے کی کوشش ہو سکتی ہے بلکہ یہ دونوں ایک تصویر کے دو پہلو ہیں۔ یا اگر ایک آبِ حیات ہے تو دُوسری آبِ حیات سے بھری ہوئی صراحی!

ٹونک کے جلسے کے کوئی ایک ہفتہ بعد مدراس میں جماعتِ اسلامی کا ایک اہم جلسہ ہوا۔ چونکہ اب مسلم لیگ اور جماعت کے اختلافات ڈھکے چھپے نہیں رہے تھے۔ لیگ کے بعض غیر ذمہ دار حامیوں اور عام مسلمانوں نے جلسے میں خلل انداز ہونے کی کوشش کی۔ اِس پر لیگ کے ذمہ دار لیڈروں نے اظہارِ معذرت بھی کیا۔ لیکن اس موقع پر مسلم لیگ کے ایک سربرآوردہ کارکن ڈاکٹر نعمت اللہ صاحب نے ایک چٹ پر لکھ کر ایک سوال مولانا کی خدمت میں پیش کیا۔ یہ آج جماعتِ اسلامی ہی نہیں بلکہ سارے پاکستان کے سامنے سب سے بڑا سوال ہے۔

"کیا اسلام اور مسلمانوں کی خدمت ایک وقت میں نہیں کی جا سکتی۔ اگر نہیں تو کیوں؟"[۱]

کوثر کے "تیر و نشتر"

ترجمان القرآن میں لیگ اور پاکستان کی مخالفت اصول کی رُو سے اور دلائل کے زور پر ہوتی رہی

---

[۱] ترجمان القرآن، جون ۱۹۴۷ء

لیکن اسلامی جماعت کا ایک اور بھی ترجمان ہے ۔۔ سہ روزہ اخبار "کوثر"۔ اس کے ایڈیٹر ہیں مولانا نصر اللہ خاں عزیز۔ جو جماعت کے نفسِ ناطقہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مولانا نصر اللہ خاں عزیز ایک کہنہ مشق صحافی ہیں وہ اپنے اخبارات کے نام شگفتہ اور دل پسند رکھتے ہیں مثلاً کوثر۔ تسنیم۔ زمزم۔ قاصد لیکن ان کی طبیعت کچھ ایسی نشتر دار واقع ہوئی ہے کہ اپنے مضامین کا مجموعہ مرتب کیا تو اس کے لئے ڈھونڈ کر تیر و نشتر نام تجویز فرمایا۔

قائدِ اعظمؒ کا استہزا آج کل کوثر کے تیر و نشتر لیگ اور لیگی حکومت کے لئے وقف ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں قیامِ پاکستان سے پہلے کی روایات ہیں جو اب بھی کوثر میں جاری ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ اس وقت قائدِ اعظمؒ زندہ تھے اس لئے لیگ اور پاکستان کے ساتھ ساتھ وہ بھی مولانا کے تیروں کا ہدف تھے۔ چنانچہ کوثر کے فائل دیکھئے۔ جا بجا اور نئے نئے انداز میں قائدِ اعظمؒ، پاکستان کا استہزا اور لیگ کی مخالفت کا اظہار ملے گا مثلاً ۲۱ جنوری ۱۹۴۷ء کے ایک مضمون میں قائدِ اعظمؒ کو ہٹلر اور مسولینی سے تشبیہ دے کر ان کا مذاق اڑایا ہے۔ عنوان ہے "ضرورت ہے" اور فرماتے ہیں :۔ - - - - - - - - - - - - - -

"ضرورت ہے ایک ہٹلر اور مسولینی کی"

اِس زمانہ میں ہٹلر نے جرمنی میں اور مسولینی نے اٹلی میں ظہور کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اپنی قوموں کو انہوں نے زمینِ پستی سے اٹھا کر آسمانِ رفعت پر بٹھا دیا۔ مسلمانوں نے دوسروں کو اس طرح ترقی کرتے ہوئے دیکھا تو انہوں نے بھی اپنے اشتہار کی عبارت بدل ڈالی۔ اب ان کے اخبارِ خیال کے صفحات پر یہ مضمون نظر افروز تھا "ضرورت ہے ایک ہٹلر اور مسولینی کی"۔

بالآخر ان کی اشتہار بازی کامیاب ہوئی۔ اشتہار بازی کا اصول یہ ہے کہ اشتہار دیئے جاؤ کسی نہ کسی روز تو گاہک پیدا ہوں گے۔ مہدی علیہ السلام سے لے کر مسولینی تک کی ضرورت کا جو اشتہار مسلسل ان کے جریدۂ خیال میں نکل رہا تھا آخر کار نتیجہ خیز ہوا اور مسٹر جناح نے اپنی درخواستِ قیادت قوم کے حضور میں گذران دی۔ قوم

نے باقی سب امیدوارانِ قیادت کو برخاست کر دیا، اور مسٹر جناح کو اپنا لیڈر تسلیم کر لیا اور قائدِ اعظم زندہ باد کے نعروں سے فضائے ہند معمور ہو گئی۔ قائدِ اعظمؒ نے بھی اپنے طرزِ عمل سے ثابت کر دیا کہ مہدی علیہ السلام نہ سہی مگر بالوی مونچھے ہٹلر اور مسولینی کی طرح تو وہ قوم کی خدمت کر ہی سکتے ہیں۔

ہم اس مرحلے پر پہنچ کر یہ سمجھتے تھے کہ قوم نے اپنا رہنما پا لیا ہے اور اب تلاشِ مزید کا سلسلہ ختم ہو جائے گا لیکن اگلے روز لاہور کے ایک مسلمان معاصر میں ہم یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ یہ ضرورت تو اب بھی باقی ہے، اس اجمال کی شرح یہ کہ جب نواکھلی میں فساد ہوا اور بہار میں بھی تباہی مچی تو مشرقی بنگال کے ہندوؤں کی دلداری کرنے، ان کی جان و مال اور آبرو کی حفاظت کا انتظام کرنے اور ان کو ان کے اجڑے ہوئے گھروں میں آباد کرنے کے لئے گاندھی جی نے جان کی بازی لگا دی۔ اور اپنے مقصد میں ایک حد تک کامیاب بھی ہو گئے۔ مگر بہار کے تباہ حال مسلمانوں کی دست گیری کے لئے مسٹر جناح دہلی سے مشرق کی طرف جانے کی بجائے الٹا دور مغرب کو چلے گئے اور کراچی میں بیٹھ کر رہ گئے۔"

پاکستان نہیں فاقستان ۱۷ رجون ۱۹۴۷ء کے کوثر میں پاکستان کا لطیف استہزا ہے:۔

"یوں تو مخالفینِ پاکستان روزِ اول سے یہ دعوے کرتے آئے ہیں کہ پاکستان بہ قاعدۂ تعریب فاقستان ہوگا۔ کاروباری لحاظ سے دیوالیہ۔ اقتصادی اعتبار سے بدحال اور مال و دولت کے حساب سے مفلس و قلاش مگر جس دن سے پاکستان کے عالمِ وجود میں آجانے کا فیصلہ ہو گیا ہے یارانِ سرِ پل مستقل پمفلٹوں کے ذریعہ اعداد و شمار پیش کر رہے ہیں جن کو دیکھ کر ایک مرتبہ تو ایک پاکستانی بھی اپنی فاقہ مستی کا یقین کر لیتا ہے۔ چنانچہ چند روز ہوئے مشہور کاروباری سیٹھ برلا نے صنعت و حرفت، زراعت و فلاحت، تجارت اور کاروبار، معدنیات و روغنیات نہروں اور سڑکوں، ریلوں اور بجلی گھروں۔ پہاڑوں اور دریاؤں۔ وادیوں اور میدانوں کے اعتبار سے ہندوستان اور پاکستان کا مقابلہ کر کے بتایا تھا کہ اول الذکر تو پورا سیٹھ ہوگا توند بڑھی ہوئی۔ تجوریاں بھری ہوئی اور اٹاریاں اٹھی ہوئی۔ مگر موخر الذکر بالکل کسان ہوگا۔ پیٹ اندر کو دھنسا ہوا گال پچکے ہوئے قرضوں کا بار سر پر اور قرقی کا وارنٹ ہاتھ میں۔

لیکن اس قسم کے کھاتے ہی" کا ایک جواب تو وہ ہے جو مسٹر جناح نے ایک امریکن اخبار کو دیا تھا۔ کہ با عزت افلاس ذلت آمیز تموّل سے بہتر ہے۔ چلئے پاکستان غریب ہی سہی مگر آزاد تو ہوگا۔ اور دوسرا جواب وہ ہے جو پاکستانی ماہرینِ اقتصادیات اعداد و شمار ہی سے دے رہے ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر انور اقبال قریشی ایم اے، پی ایچ ڈی کا ایک مضمون اخبارات میں شائع ہوا ہے جس کا عنوان یہ ہے" اقتصادی نقطۂ نگاہ سے پاکستان کا شمار دنیا کے امیر ترین ملکوں میں ہوگا"۔ چلئے حساب کا جواب حساب سے، دعوے کا جواب دعوے سے اور اندازے کا جواب اندازے سے ہوگیا۔ کل کو جو ہوگا وہ دیکھا جائے گا۔ آج کی بحث کا تو فیصلہ ہوگیا۔ ع

"قصّہ کوتہ گشت ورنہ دردِ سر بسیار بود"

"لنگڑا پاکستان" ۱۳ رجون ۱۹۴۷ء کے مقالہ افتتاحیہ کا عنوان ہے "لنگڑا پاکستان" اور ماحصل مضمون یہ ہے۔ کہ "پاکستان کو لنگڑا کہہ لیجئے یا لُولا۔ اس سے مسلمانانِ ہند کی مشکلات رفع ہوں یا نہ ہوں۔ اس سے مشرقی پاکستان کے مسلمانوں کے ساتھ انصاف ہو یا ظلم۔ اس سے پاکستان کا مستقبل کامیاب ہو یا ناکامیاب۔ بہرحال سالہا سال کی جدوجہد کا قدرتی اور لازمی نتیجہ ہے اور اس راہ کی منزل جس پر مسلم لیگ کا قافلہ چل رہا تھا۔"

قائدِ اعظمؒ اور پاکستان کے متعلق جماعتِ اسلامی کے اخبار کوثر میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا۔ ان پر تعجب نہیں ہونا چاہئے۔ کیونکہ اس کے ایڈیٹر کانگریسی خیالات کے تھے۔ اور وہ کانگریسی مسلمانوں کے راہنما مولانا ابوالکلام آزاد کے غالی عقیدت مندوں میں سے ہیں۔ خطبات ابوالکلام کے شروع میں مولانا نصر اللہ خاں عزیز کا دیباچہ پڑھیئے۔ منجملہ اور چیزوں کے ایک جگہ فرماتے ہیں:۔

"امرت سر کے جلیانوالے باغ میں عشا کے وقت مولانا تقریر کر رہے تھے۔ مجھے وجدان ہی سے نہیں آنکھوں سے اس طرح محسوس ہو رہا تھا گویا تقریر ایک نور کی چادر کی طرح تمام مجمع پر چھائی ہوئی ہے۔ یکایک قریب کی ایک مسجد سے اذان کی صدا بلند ہوئی۔ خطبہ تھوڑی دیر کے لئے رُک گیا۔ میں نے اس طرح محسوس کیا گویا کسی نے چادر کو چاک کر کے مجمع کے سروں پر سے کھینچ لیا ہے۔"

پتہ نہیں کہ اگر کوئی مسلم لیگی یا "مغرب زدہ" اذان کے متعلق کہتا کہ اس سے ایک "نور کی چادر" چاک ہو گئی۔ تو اس کے متعلق اسلامی جماعت کے راہنما کیا فتوے دیتے اور خود کوثر اسے کیسے کیسے "تیر و نشتر" کا نشانہ بناتا!

مولانا نصر اللہ خاں ایک زمانہ میں بجنور کے مشہور کانگریسی اخبار مدینہ کے ایڈیٹر تھے۔ جو قیام پاکستان و آزادیِ ہند سے پہلے کانگریسی مسلمانوں کا سب سے زیادہ باثر اخبار تھا۔ اس اخبار کے ایڈیٹر کی حیثیت سے مولانا نے مسلم لیگ کو ناکام بنانے کی جو کوشش کی اس کے لئے مدینہ کے فائل کا مطالعہ بڑا سبق آموز ہو گا۔ آج کانگریسی حکومتوں کی عملی پالیسی نے مدینہ اور الجمعیۃ دونوں کا رنگ ایک حد تک بدل دیا ہے لیکن یہ بھی طرفہ تماشا ہے کہ مولانا عزیز اور ان کے ساتھی آج بھی اپنی کوششوں پر نازاں ہیں۔ جو انہوں نے لیگ کی ناکامی اور کانگرس کی کامیابی کے لئے کیں، (اور پھر بیٹھے بھی ہیں تو فاقستان لنگڑے پاکستان میں) جماعتِ اسلامی کراچی کے اخبار جہانِ نو میں یکم دسمبر ۱۹۴۹ء کو (یعنی آزادی بھارت اور مشرقی پنجاب دہلی وغیرہ میں مسلمانوں کے قتلِ عام کے ڈھائی سال بعد) جماعت کے ایک سرگرم کارکن اور کوثر کے ایڈیٹوریل بورڈ کے رکن کا مضمون "مولانا نصر اللہ خاں عزیز" کے متعلق شائع ہوا ہے اس میں وہ لکھتے ہیں:-

"اس اہم ترین مورچے کا کمانڈر نصر اللہ خاں عزیز تھا۔ عزیز ارضِ پاک کا سب سے بڑا مسلمان صحافی۔

یہ عزیز کمانڈر مجھے کئی سال پہلے بھی عزیز رہ چکا تھا جب یہ آزادی پسند صفوں میں شریک تھا اور "مدینہ" بجنور کے ذریعہ مسلمانوں کو آزادی کی جدوجہد میں حصہ لینے کی دعوت دے رہا تھا۔ اس عقیدت کو استوار کرنے میں سب سے زیادہ "مدینہ" کا حصہ تھا۔ اس کا ایک ایک ورق پڑھتا اور اس کے استدلالی ہتھیاروں سے لیس ہو کر اپنے ہم جماعت ساتھیوں سے ذہنی کشتی لڑا کرتا۔ ان دنوں قائدِ اعظم مرحوم کے اعجاز سے مسلم لیگ کے قالب میں از سرِ نو جان پڑ چکی تھی اور یہ سالوں کا مُردہ چاق چوبند ہو کر آزادی پسند جماعتوں سے پنجہ کرنے لگا تھا۔ سب سے پہلا بڑا معرکہ بجنور کی سرزمین پر ہوا تھا۔ یو پی اسمبلی کی نشست کے لئے کانگریس کے ٹکٹ پر حافظ محمد ابراہیم کھڑے ہوئے تھے۔ اور مسلم لیگی امیدوار مولوی عبد السمیع تھے۔ حافظ محمد ابراہیم کو شکست دینے کے لئے پنجاب اور ہندوستان کے دوسرے گوشوں سے بڑے بڑے لیڈر پہنچ چکے تھے۔ مولانا ظفر علی خاں نے اس کو معرکہ حق و باطل کا نام دے کر ایک نظم بھی کہی تھی جس

کا قافیہ اور ردیف "ابراہیم ادھر" اور "تسلیم ادھر" وغیرہ تھی جب اس معرکہ کا نتیجہ نکلا تو ہماری خوشی کا ٹھکانا نہ تھا۔ حافظ ابراہیم ووٹوں کی بھاری اکثریت سے کامیاب ہو گئے تھے۔ اس مسرت انگیز خبر کے ساتھ ہی "مدینہ" آیا۔ پہلے ہی صفحہ پر حافظ محمد ابراہیم کی کامیابی پر نصراللہ خاں عزیز کی نظم تھی۔ مولانا ظفر علی خاں کی نظم کی زمین میں اسی قافیہ اور ردیف کی پابندی کے ساتھ۔ بہت ہی دلچسپ اور وجد انگیز تھی اور "پگڑی اچھال" اخبارات کی اصطلاح میں مولانا کی نظم کا "دندان شکن" جواب تھی۔ اس روز میں نے نہ جانے کتنی ہی بار اس نظم کو دہرایا۔ یہاں تک کہ وہ میرے ذہن پر نقش ہو گئی۔ اور آج بھی جب کہ کتنی ہی حسین یادیں ماضی اپنے ساتھ دفن کر چکا ہے۔ اس نظم کا آخری شعر میرے ذہن سے چمٹا ہوا ہے۔

"ساکنانِ خطۂ بجنور نے دِکھلا دیا
دشمنانِ ملک کی ہوتی نہیں تسلیم ادھر"

پنجاب میں لیگ ـ یونینسٹ کشمکش اور "کوثر" کا رویہ

اسلامی جماعت کے راہنما لیگ کو بیکار اور آرام طلب لوگوں کی جماعت کہتے تھے "جن کی بزدلی" پر بقول مولانا مودودی "دشمنوں کو بھی پورا پورا اعتماد ہے"[1]۔ جو جیل میں جانے اور لاٹھیاں کھانے سے ڈرتے تھے لیکن حیرت اس بات پر ہے کہ جب پنجاب میں مسلم لیگ کے لیڈر جیل جانے اور لاٹھیاں کھانے پر تُل گئے تو کوثر پھر بھی اس تحریک کے نکتہ چینوں میں پیش پیش تھا۔ ع

میں ہوا کافر تو وہ کافر مسلمان ہو گیا

پنجاب مسلم لیگ کی تحریک سول نافرمانی کو پاکستان کے حصول میں جو اہمیت حاصل ہے۔ اس سے سیاسی مورخ ناواقف نہیں۔ ہندو اور سکھ جانتے تھے کہ جب تک پنجاب کی گدی پر مسلم لیگ کے دشمن ملک خضر حیات خاں ٹوانہ قابض ہیں۔ اس صوبہ کے پاکستان میں شامل ہونے بلکہ پاکستان بننے کا کوئی امکان نہیں مسلم لیگ کی تحریک سول نافرمانی غداری اور اسلام دشمنی کے اس سنگِ گراں کو پاش پاش کرنے کے لئے شروع ہوئی۔ اور مسلم جمہور کے زورِ بازو سے جو کامیابی حاصل ہوئی وہ صوبے۔ اس کے باشندوں اور مسلم لیگ کے لئے باعثِ فخر

---

[1] سیاسی کشمکش حصہ دوم (ص آخر)

ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ قائدِ اعظمؒ کے تدبر سے پاکستان کا حصول زیادہ تر تو کاغذی کارتوسوں" کی مدد سے یعنی سیاسی اور تدبیری (TACTICAL) طریقِ کار سے ہوگیا۔ لیکن پنجاب میں حصولِ مقصد کے لئے مسلم لیگ کو حکومت کے خلاف باقاعدہ صف آرا ہونا پڑا۔ اور وُہ بھی ایسی حکومت کے خلاف جو اپنی بے آئینی، جبر اور تشدد کے لحاظ سے غیر منقسم ہندوستان کی سب صوبجاتی حکومتوں سے بڑھ چڑھ کر تھی لیکن قوم نے اپنی تنظیم ایثار اور ہمت وجرأت سے سب مشکلوں پر غلبہ پایا۔ سینکڑوں نہیں ہزاروں نے قید وبند کی سختیاں جھیلیں۔ زعمائے قوم نے جن کے متعلق کہا جاتا تھا کہ وُہ کسی قربانی کے اہل نہیں۔ قوم کی آواز پر لبیک کہا۔ اور ہر طرح کی سختیاں اور ذلتیں برداشت کیں۔ قوم کی معزز اور پردہ دار خواتین نے اس تحریکِ آزادی میں پُورا حصّہ لیا۔ اور ظلم وستم اور اسلام دشمنی کے قلعہ کو مسمار کرنے کے لئے وہی کچھ کیا جو قرونِ اولےٰ میں عرب عورتیں کفار کے ساتھ جنگ کے دوران میں کیا کرتی تھیں۔ مسلمانوں میں سول نافرمانی کی یہ پہلی تحریک تھی۔ غیر جانبدار مبصرین کا قول ہے کہ جس منظّم اور موثر طریقے سے مسلمانوں نے یہ تحریک چلائی۔ اس کی مثال باردولی کی سول نافرمانی میں بھی نہیں ملتی جسے ستیہ گرہ کے تجربہ کار ماہرین نے چلایا۔ پانچ ہی ہفتوں میں ہندوستان کی سب سے مستحکم اور جابر حکومت کا نظام درہم برہم ہوگیا۔ اور اسے مسلم لیگ کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پڑے۔

انصاف کا تقاضہ تو یہ تھا کہ جو حضرات "مدینہ" اور "الجمعیۃ" میں مسلم لیگ کی کم ہمتی کی نوحہ خوانی کرتے نہ تھکتے تھے جن کے خیال میں لیگی لیڈر "قوم کے لئے اپنا بال تک بیکا ہونا گوارا نہیں کر سکتے تھے"۔ وُہ اس صورتِ حال سے خوش ہوتے لیکن یہاں معاملہ برعکس ہے۔ "کوثر" کے صفحات دیکھئے۔ ملک خضر حیات خاں اور اُن کی یونینسٹ حکومت کی کسی بات کے خلاف اِس تحریک سے پہلے، اس کے دوران میں، یا اس کے بعد ایک حرف نہیں۔ ہاں مسلم لیگ کی تحریک کے خلاف جابجا مخالفانہ اور معاندانہ اظہارِ خیال ہے بلکہ علما کو تلقین ہے کہ وُہ اس جہادِ حریّت کے خلاف صف آرا ہوں۔

۲۱ر فروری ۱۹۴۷ء کے "کوثر" میں یونینسٹ گورنمنٹ کے منظورِ نظر اخبار انقلاب سے ذیل کی عبارت

لے ملاحظہ ہو مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصّہ دوم (مولانا مودودی) صہ ۲۱۶

نقل ہوتی ہے :۔

"کیا تحریک چلانے والوں سے یہ عرض کرنے کی ضرورت ہے کہ صحیح الخیال اور راسخ العقیدہ اور غیرت مند مسلمان، عورتوں کے جلوسوں کو دیکھ کر شرم سے گردن جھکا لینے پر مجبور ہیں۔ ہماری برقعہ پوش بہنیں۔ اور بعض بے پردہ عورتیں جلوسوں میں نکلتی ہیں۔ سڑکوں پر پھرتی ہیں۔ نعرے لگاتی ہیں۔ اور بعض جوش میں آکر برقعے بھی اٹھا دیتی ہیں۔ اور اس طرح ان تمام ذلتوں اور رسوائیوں کا نشانہ بنتی ہیں۔ جو اس قسم کے جلوسوں سے وابستہ ہیں۔"

کوثر علمائے کرام کو طعنہ دے کر گرماتا اور اُبھارتا ہے کہ تحریک کے خلاف میدان میں آئیں۔ ملاحظہ ہو :۔

"ہمارے نزدیک "مستورات" وہ علمائے کرام ہیں جو الیکشن کے زمانے میں تو اپنے علم و تقویٰ اور درس و تعلیم کے گوشوں سے نکل کر منبر و محراب میں جلوہ گر ہو گئے تھے۔ مگر اب اسلامی اخلاق اور وقار کو سرِ بازار رُسوا ہوتے دیکھتے ہیں۔ اور اپنے حجروں میں اس طرح دبکے ہیں گویا مستورات ہیں۔ جن کا گھروں سے باہر نکلنا شرعاً ممنوع ہے، بڑے بڑے مدعیانِ توحید جو الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ پر کہنے والے کا مُنہ نوچ لیا کرتے تھے۔ اب نعرۂ حیدری یا علیؓ کا غلغلہ سُنتے ہیں اور ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ بلکہ اس سیلاب میں اپنی لیڈری کی کشتی کو بے بسی کے ساتھ بہائے لئے جا رہے ہیں"۔

کوثر نے اس تحریک کے متعلق ۱۷ فروری کو ایک مستقل مقالہ افتتاحیہ لکھا عنوان تھا "درسِ عبرت"۔ اس میں لیگ کی تحریک کے متعلق ذیل کا فتوائے عالیہ درج ہے :۔

"جلسوں کی تقریریں جلوسوں کی ترتیب۔ ان کے نعرے اور ان کے آوازے۔ ایک شے بھی ایسی نہیں جس کو اسلامی اخلاق و شرافت کے ساتھ کسی قسم کا تعلق ہو"۔

مسلم لیگ کی تحریک برسوں کے ظلم و ستم کے خلاف ایک ردِ عمل کی حیثیت رکھتی تھی اور ایک پُرجوش عوامی تحریک تھی۔ ممکن ہے کہ بعض موقعوں پر بے اعتدالیاں ظہور پذیر ہوئی ہوں۔ مگر لیگی لیڈروں کی مسلسل کوشش تھی کہ تحریک کو ہر طرح کی بدعنوانیوں سے محفوظ رکھا جائے۔ اور لیگی راہنما (جیسا کہ کوثر کا اعتراف ہے) بار بار لوگوں

کو متنبہ" کرتے رہے لیکن حیرت اِس بات پر ہے کہ پنجاب میں برسوں یونینسٹ پارٹی کی حکومت رہی۔ برائے نام چند وزیر تھے لیکن فی الحقیقت انگریز آئی۔سی۔ایس افسروں اور انسپکٹر جنرل پولیس کی حکومت تھی جنگ کے دوران میں انہوں نے جس ظلم و جبر سے کام لیا۔ اور جس طریقے سے جنگی چندے وصول کئے۔ ہر پنجابی کو معلوم ہے مسلمان صوبے میں اکثریت میں تھے لیکن لڑائی کے بعد جو وزارت قائم ہوئی۔ اس میں اصل اقتدار لالہ بھیم سین سچر اور سردار سورن سنگھ کے ہاتھ میں تھا لیکن اِس ظلم و ستم اور صریح بے انصافی کے خلاف کبھی کوثر نے احتجاج نہیں کیا آپ کو ڈھونڈے سے بھی کوثر کے صفحات میں یونینسٹ گورنمنٹ کے خلاف (لیگ کی تحریک کے دوران میں یا اس سے پہلے یا بعد میں) ایک حرفِ شکایت نہ ملے گا لیکن اس ظلم و ستم اور ملت کُشی کو ختم کرنے کے لئے ایک تحریک شروع ہوتی ہے۔ کوثر میں اس کی خوبیوں کے متعلق ایک لفظ نہیں، فقط شکایتیں اور ملامتیں ہیں۔

خیر مسلم لیگ نے اپنی تحریک جاری رکھی۔ پولیس کی لاٹھیاں چلتی رہیں۔ جیل خانے بھر دیئے گئے۔ صوبے میں ہر طرف گرفتاریوں، ضبطیوں اور جرمانوں کا دور دورہ تھا اور اس دوران میں وُہ حضرات جو لیگی قیادت کی بزدلی اور کم ہمتی کی شکایت کیا کرتے تھے اب لاٹھیاں کھانے اور جیل جانے والوں پر اپنے "تیر و نشتر" کے وار کرتے رہے لیکن انجام کار کیا ہؤا۔ لیگ نے یہ معرکہ جیت لیا۔ یونینسٹ گورنمنٹ کو مستعفی ہونا پڑا۔ اور پاکستان کا راستہ صاف ہو گیا۔

جماعتِ اسلامی کی تاریخ

قیامِ پاکستان کے بعد

اسلامی جماعت اور حکومت کے درمیان اشتراکِ عمل

مولانا مودودی نے اپنے پیروں کو تحریکِ پاکستان سے علحدہ رہنے کی ہدایت کی تھی۔ بلکہ پاکستان اور لیگ کے خلاف زوردار طریقے سے اظہارِ خیال کیا تھا۔ قیامِ پاکستان (۱۵ اگست ۱۹۴۷ء) سے پہلے کی ہمیں کوئی تحریری شہادت نہیں ملی جس سے یہ ظاہر ہو کہ ان کا ارادہ ہندوستان کا قیام ترک کر کے پاکستان آنے کا تھا۔ غیرِ منقسم ہندوستان میں ترجمان القرآن کا آخری پرچہ جون ۱۹۴۷ء کا ہے۔ اس میں مولانا کی ایک تقریر درج ہے جس میں وہ فرماتے ہیں:۔

"میں آپ لوگوں سے اکثر کہتا رہا ہوں کہ اسلامی انقلاب پیدا کرنے کا جتنا امکان مسلم اکثریت کے علاقوں میں ہے۔ قریب قریب اتنا ہی امکان غیر مسلم اکثریت کے علاقوں میں بھی ہے۔ میری اس بات کو بہت سے لوگ ایک غرقِ تخیل آدمی کا خواب سمجھتے ہیں۔ اور بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ غالباً یہ تصوّف کا کوئی نقطہ ہے جو ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔"

ان کی اس تقریر سے یہ بات صاف عیاں ہے کہ آزادیِ ہندوستان کے بعد ان کا ارادہ دونوں علاقوں میں کام کرنے کا تھا۔ چنانچہ وہ اس تقریر میں دوسری جگہ کہتے ہیں:۔ "آنے والے اس دور میں ہندوستان اور مسلم ہندوستان کے حالات بالکل ایک دوسرے سے مختلف ہوں گے۔ اور چونکہ ہمیں دونوں علاقوں میں کام کرنا ہوگا اس لئے ہمیں بھی اپنی تحریک کو دو مختلف طریقوں پر چلانا پڑے گا۔"

مولانا مودودی کے تو یہ ارادے تھے لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے دن

ہندوستان کو آزادی ملی۔ اور بہت سے وہ خطرات و خدشات جن سے سرسیدؒ کے وقت سے مسلمان زعماء ڈر رہے تھے اور جن سے بچنے کے لئے انہوں نے پہلے مسلمانوں کے حقوق اور دوسرے تحفظات اور پھر پاکستان پر زور دیا۔ حقیقت بن کر سامنے آ گئے اور مشرقی پنجاب تو ایسا میدانِ حشر بنا کہ وہاں جماعتِ اسلامی کا کام کرنا تو ایک طرف، کسی مسلمان کا زندہ بچ رہنا بھی مشکل ہو گیا۔ چنانچہ جماعت کے اراکین وہاں سے ہجرت کر کے پاکستان میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔ پٹھان کوٹ اور دوسرے علاقوں سے جماعت کے کارکن فوجی حفاظت میں ۱۵ اگست سے ۳۰ اگست تک لاہور پہنچائے گئے۔ اور اسلامیہ پارک پونچھ روڈ میں جماعت کا مرکز قائم ہوا۔

اسلامی جماعت نے پاکستان کے قیام سے پہلے ہر طرح مسلم لیگ کی مخالفت کی تھی۔ اور پاکستان کے متعلق ان تمام امیدوں کو جھوٹا بتایا تھا جن سے تحریکِ پاکستان کو مدد ملی تھی۔ ہو سکتا تھا کہ قیامِ پاکستان کے بعد حکومتِ پاکستان اسلامی جماعت کی ان مخالفانہ کوششوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جماعت سے ایک مخالف کا سا برتاؤ کرتی لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ جماعت کے ساتھ پورا تعاون کیا گیا۔ ریڈیو ایک سرکاری ادارہ ہے لیکن ریڈیو پاکستان پر کثرت سے مولانا مودودی کی تقریریں کرائی گئیں۔ (جن میں سے بعض کتابی صورت میں شائع ہو چکی ہیں) پناہ گزینوں کے کیمپوں میں ان سے بڑی مدد لی گئی۔ اس وقت جس پیمانہ پر اور جس رفتار سے ساٹھ لاکھ مسلمانوں کو مشرقی پنجاب کے محشرستان سے نکالنے کا کام ہو رہا تھا۔ ظاہر ہے اس میں جماعت کی مختصر اور نیم منظم کوششیں کوئی خاص فرق پیدا نہ کر سکتی تھیں لیکن جماعت کے اکابر سے جو کچھ ہو سکا انہوں نے کیا۔ اور حکومت نے ان سے اشتراکِ عمل کیا بلکہ بعض مقامی مذہبی جماعتوں کے مقابلہ میں انہیں ترجیح دی۔

قیامِ پاکستان کے بعد اسلامی جماعت اور حکومت کے درمیان خوشگوار روابط کا آغاز ہو گیا تھا لیکن تعلقات میں رخنے بھی جلد پیدا ہونے شروع ہو گئے۔

مولانا مودودی کے سیاسی ولولے واقعہ یہ ہے کہ شروع سے مولانا مودودی نے اپنا مقصد یہ معین کر لیا تھا کہ ان کی پارٹی "زیادہ سے زیادہ سیاسی طاقت" فراہم کر کے "حکومت کی مشین پر قابض ہو جائے۔"

دسمبر ۱۹۳۷ء کے ترجمان القرآن میں مولانا کا ایک مضمون "ادارہ دارالاسلام" کے متعلق شائع ہوا تھا اس میں وہ اپنی پارٹی کے مقاصد کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

"یہ پارٹی اسلام کے اصولوں پر ایک نئے اجتماعی نظام (SOCIAL ORDER) اور ایک نئی تہذیب (CIVILISATION) کی تعمیر کا پروگرام لے کر اُٹھے اور عامۂ خلائق کے سامنے اپنے پروگرام کو پیش کر کے زیادہ سے زیادہ سیاسی طاقت فراہم کرے اور بالآخر حکومت کی مشین پر قابض ہو جائے۔"

جب کسی پارٹی کے یہ ارادے ہوں تو اس کی حکومت سے آویزش ناگزیر ہے۔ جماعت نے اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے سب سے پہلا حربہ یہ اختیار کیا کہ حکومتِ وقت اور اراکینِ حکومت کے متعلق طرح طرح کے الزامات لگانے شروع کئے یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ اور اس کا ذکر ہم آئندہ باب میں کریں گے لیکن قیامِ پاکستان کے بعد دو امور جن پر حکومت اور مولانا مودودی کے درمیان بنیادی اختلافات رُونما ہوئے اور جن کی بنا پر بالآخر مولانا نظر بند کر لئے گئے "حلفِ وفاداری" اور "جنگِ کشمیر" کے متعلق مولانا کا نقطۂ نظر تھے۔

سرکاری ملازموں کو حلفِ وفاداری سے باز رکھنے کی کوشش

حلفِ وفاداری کا قضیہ اس طرح پیش آیا کہ یومِ آزادی کے بعد ہندوستان کی مرکزی اور صوبجاتی حکومتوں نے اپنے ملازمین سے کہا کہ وہ وفاداری کا حلف اٹھائیں۔ ایسے حلف عام طور پر ذمہ دار عہدہ داروں اور وزراء سے لئے جاتے ہیں۔ لیکن چونکہ یہاں آزادی نئی نئی ملی تھی اور ہر سرکاری ملازم (بالخصوص اقلیتوں) کی نسبت نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ دل سے نظامِ حکومت کے وفادار ہیں۔ اس لئے ہندوستان میں چھوٹے چھوٹے ملازمین سے بھی یہ حلف لئے گئے۔ پاکستان میں عام طور پر یہ طریقہ اختیار نہیں کیا گیا لیکن (مغربی) پنجاب کی حکومت نے (غالباً ہندوستان کی مثال دیکھ کر) اپنے ملازمین کو حکم دیا کہ وہ حکومتِ پاکستان کی وفاداری کا حلف لیں۔ بعض سرکاری ملازمین نے جو جماعتِ اسلامی سے وابستہ تھے امیر جماعت سے استصواب کیا۔ مولانا نے رائے دی کہ چونکہ اس حلف سے اس نظامِ حکومت سے وفاداری کی قسم کھانی پڑتی ہے "جو از روئے قانون قائم ہے"۔ اس لئے یہ حلف

اس وقت تک ناجائز ہے جب تک یہ نظامِ حکومت پورے طور پر اسلامی نہ ہو جائے۔ چنانچہ ایک دو سرکاری ملازموں نے اس مشورے کی تعمیل میں حلف لینے سے انکار کر دیا۔ اور ان کے خلاف محکمانہ کارروائی ہوئی۔ مثلاً "نوائے وقت" کی اشاعت ۴ ستمبر ۱۹۴۸ء میں لکھا ہے کہ "سول سکریٹریٹ کے ایک اسسٹنٹ کو اس بنا پر معطل کر دیا گیا ہے کہ اس نے پاکستان سے وفاداری کا حلف اٹھانے سے انکار کر دیا۔ اور یہ کہا کہ میں اس صورت میں پاکستان کا وفادار رہ سکتا ہوں جس صورت میں اس کا نظامِ حکومت شرعی ہو۔"

جہادِ کشمیر کی مخالفت مسئلہ حلفِ وفاداری پر اسلامی جماعت نے جو روش اختیار کی اس نے گورنمنٹ کو چوکنا کر دیا تھا لیکن اس سے بھی زیادہ کشیدگی جہادِ کشمیر کے متعلق مولانا مودودی کے ایک بیان سے ہوئی۔ اس کا آغاز اس طرح ہوا کہ مئی ۱۹۴۸ء کے دوسرے ہفتے میں مولانا جماعتِ اسلامی سرحد کے اجتماع پر پشاور تشریف لے گئے۔ وہاں ان دنوں جہادِ کشمیر کا بڑا چرچا تھا۔ قبائلی مجاہد پشاور سے گزر کر پونچھ اور کشمیر کے دوسرے مقامات کو جا رہے تھے۔ مولانا کے قیام کے دوران میں آزاد کشمیر گورنمنٹ کے ایک بہی خواہ[1] نے اس زعم میں کہ الجہاد فی الاسلام کے مصنف کو جہاد سے خاص دلچسپی ہوگی۔ اور ان کی رائے سے آزاد کشمیر گورنمنٹ کو اپنے مقصد میں مدد ملے گی۔ مولانا سے جہادِ کشمیر کے متعلق استفسار کیا۔ مولانا نے کچھ تامل کے بعد جہادِ کشمیر کی نسبت فرمایا۔ "پاکستان کے باشندوں کے لئے اس میں حصہ لینا اس وقت تک جائز نہیں جب تک ان کی نمائندہ حکومت اور حکومتِ ہند کے درمیان معاہدانہ تعلقات ہیں[2]"۔ مستفسر یہ جواب سن کر ششدر رہ گیا۔ اور فریقین میں کچھ تلخ سی بحث ہوئی۔ پشاور کے ایک مقامی اخبار میں اس گفتگو کا کچھ حصہ شائع ہوا۔ اور چند روز بعد لاہور کے اخبار "سول اینڈ ملٹری گزٹ" نے (جس کا مالک ایک

---

[1] "ترجمان القرآن" میں تو صاحب استفسار کو فقط "ایک کشمیری بزرگ" کہا گیا ہے لیکن "مولانا مودودی کی نظر بندی کیوں" کے نام سے جماعت اسلامی کے شعبۂ نشر و اشاعت نے جو پمفلٹ شائع کیا ہے اس میں لکھا ہے کہ مستفسر "آزاد کشمیر گورنمنٹ کے نشر و اشاعت کے انچارج جناب نبی بخش نظامی تھے"۔

[2] ترجمان القرآن جون ۱۹۴۸ء (ص ۱۱۹)

ہندو اور ایڈیٹر ایک انگریز تھا) مولانا کی اس رائے کو اچھالا۔ حتیٰ کہ مولانا کے اپنے بیان کے مطابق کشمیر کے متعلق ان کے بیانات کو جموں ریڈیو، آل انڈیا ریڈیو اور شیخ عبداللہ کی حکومت نے بہت غلط معنی پہنا کر نشر کیا ہے۔ اور اس سے جموں و کشمیر کی آزادی کے لئے لڑنے والوں کو نیز اہلِ کشمیر کو گمراہ کرنے کی کوشش کی۔[1]

جب مولانا کی رائے کی یوں اشاعت ہوئی تو اسلامی اخبارات میں ایک ہنگامہ مچ گیا۔ اکثر اخبارات نے اس پر کڑی نکتہ چینی کی۔ بلکہ جماعت اسلامی کے بعض افراد نے بھی مولانا سے زیادہ احتیاط اور معاملہ فہمی کا مطالبہ کیا۔ چنانچہ مولانا نے اس مسئلے پر "جنگِ کشمیر" کے عنوان سے ("جہادِ کشمیر" نہیں) جون ۱۹۴۸ء کے ترجمان القرآن میں ایک طویل مقالہ لکھا جس کا قوم اور ملک کے تمام بہی خواہوں کو بغور اور نہایت ٹھنڈے دل سے مطالعہ کرنا چاہیئے تاکہ وہ اندازہ لگا سکیں کہ مولانا مودودی کے خیالات کی پیروی سے قوم اور ملک کیسی کیسی الجھنوں سے دوچار ہوں گے۔

جماعتِ اسلامی کے شعبۂ نشر و اشاعت نے مولانا کی نظربندی پر ایک پمفلٹ شائع کیا تھا۔ اس میں لکھا ہے:۔

"اکابرِ حکومت نے ایک طرف تو یہ کیا کہ جماعتِ اسلامی کو انگریز کے قانون کے تحت سیاسی جماعت قرار دے کر سی آئی ڈی کی نگرانی اور خطوط کے سنسر کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اور دوسری طرف یہ سازش شروع کی کہ ایسا کوئی شوشہ چھوڑا جائے جس سے مولانا موصوف اور جماعتِ اسلامی کو پہلے بدنام کیا جا سکے۔ اور پھر انہیں اور اُن کے خاص خاص ساتھیوں کو گرفتار کر کے نظامِ اسلامی کی اس تحریک کا سارا جھگڑا ہی ختم کر دیا جائے۔ کشمیر کا مشہور قضیہ دراصل اس سازش کا نتیجہ تھا۔ یہ قضیہ کس طرح اٹھایا گیا۔ اس کی اصلیت کیا تھی۔ اور اس سے کیا کام لیا گیا۔"

آگے چل کر پشاور کی گفتگو اور اس کی اشاعت کا اجمالاً ذکر کرنے کے بعد اس رسالہ میں لکھا ہے:۔

---

[1] ملاحظہ ہو رسالہ "مولانا مودودی کی نظربندی" ص ۹

"دُنیا یہ سُن کر حیران ہوگی! اور مولانا اور جماعت کے دوسرے لوگ بھی اِس اِنکشاف پر سخت حیران ہوئے تھے کہ یہ صاحب جنھوں نے اس طرح پرائیویٹ مجلس میں مولانا سے ایک بات پوچھی اور پھر ان کے جواب کو کسی قدر تحریف کے ساتھ دنیا بھر میں پھیلایا۔ یہ کوئی ہندوستانی حکومت یا مہاراجہ ہری سنگھ کے ایجنٹ نہیں تھے۔ بلکہ آزاد کشمیر گورنمنٹ کے نشر و اشاعت کے انچارج جناب نبی بخش نظامی تھے۔ ان صاحب کا نام اور منصب معلوم کرنے کے بعد شاید کسی ہوشمند آدمی کو بھی اس امر میں شک نہ رہے گا کہ یہ صاحب مولانا کے پاس خود نہیں آئے تھے بلکہ بھیجے گئے تھے! اور ان کا اس بات کو شائع کرنا کسی نادان بچے کی حماقت نہیں بلکہ خوب سوچی سمجھی اسکیم کا نتیجہ تھا۔"

شعبۂ نشر و اشاعت کے رسالہ میں جس بھونڈے طریقے سے آزاد کشمیر گورنمنٹ پر بہتان باندھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسے محض پراپگنڈا کی ایک چال سمجھ کر نظر انداز کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ قطع نظر اس امر کے کہ سازش کا ذرا ثبوت نہیں دیا گیا۔ شواہد تمام تر اس کے خلاف ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر حکومت کا مقصد "جماعتِ اسلامی" کو بدنام کرنا تھا تو اس کے لئے آزاد کشمیر گورنمنٹ کے کسی ملازم کو بیچ میں لانے کی کیا ضرورت اور کیا مصلحت تھی۔ یہ کام تو زیادہ آسانی سے حکومت کے کسی اپنے کارندے یا لیگ کے کسی راہنما کی معرفت ہو سکتا تھا۔

اس کے علاوہ اصل چیز تو مولانا کی رائے اور ان کے خیالات ہیں۔ کیا حکومتِ پاکستان یا آزاد کشمیر نے کوئی سازش کر کے مولانا کے دماغ میں یہ خیالات ڈال دیے تھے؟

اور اگر یہ کہا جائے کہ پشاور میں کوئی سازش تھی تو ترجمان القرآن کا مضمون لکھتے وقت مولانا کس سازش کا شکار ہوئے تھے کیونکہ جو رائے مولانا سے پشاور میں منسوب کی گئی تھی "ترجمان القرآن" میں بھی عین اسی رائے کا اظہار ہے۔

اور پھر مولانا کی فہم و فراست کے متعلق کیا کہا جائے جو معمولی سرکاری ملازموں کی "سازشوں" کا شکار ہو جاتے ہیں۔

شعبۂ نشر و اشاعت کا رسالہ مولانا مودودی کی رہائی کے لئے پراپگنڈا کرنے کا ایک ذریعہ تھا مقصد نیک مرتّب نے سوچا کہ اس کے لئے جو حربہ ہاتھ لگے استعمال کر لیا جائے۔ چنانچہ سازش کا افسانہ تراشا گیا ہمارا ذاتی خیال ہے کہ اگر مولانا مودودی کی نظر سے یہ رسالہ گزرتا تو وہ سازش کا قصہ درج کتاب نہ ہونے دیتے۔ مولانا مودودی نے جہادِ کشمیر کی نسبت جو کچھ کہا تھا وہ اصول کی رُو سے تھا۔ ہمارے خیال میں ان کی رائے نہ صرف غلط بلکہ حالات اور زمانے کے اعتبار سے شدید طور پر مفسدانہ تھی لیکن یہ رائے اُن کے نظریات اور افتادِ طبع کا قدرتی نتیجہ اور ایک آیت قرآنی پر مبنی تھی۔ ان کا فرمانا تھا:-

"آخر اسلامی نظامِ حکومت کے معنی ہی کیا ہیں، اگر اس کا بنیادی اصول یہ نہ ہو کہ ملک کی داخلی سیاست اور خارجی پالیسی کے معاملہ میں اتباع صرف کتاب اللہ اور سُنّتِ رسولؐ کا ہوگا۔ نہ کہ قومی خواہشات اور دنیوی مصلحتوں کا"[1]

مولانا نے اس رائے کے اظہار بلکہ اس کی صحت سے کبھی رجوع نہیں فرمایا۔ ایسی رائے کے اظہار کو جسے خود مولانا نے اس وضاحت اور وثوق سے جماعتِ اسلامی کے رسالہ ترجمان القرآن میں شائع کیا ہو۔ ایک سازش کا نتیجہ بتانا عقیدت نہیں غلط وکالت کا کرشمہ ہے۔

"ترجمان القرآن میں مولانا نے مسئلے پر شرعی حیثیت سے بحث کی تھی ان کا فرمانا تھا کہ اُن کی رائے۔ در اصل قرآن مجید کے ایک صریح حکم پر مبنی ہے:-

وَالَّذِیْنَ آمَنُوْا وَلَمْ یُھَاجِرُوْا مَالَکُمْ مِّنْ وَّلَایَتِھِمْ مِّنْ شَیْءٍ حَتّٰی یُھَاجِرُوْا وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ فَعَلَیْکُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰی قَوْمٍ بَیْنَکُمْ وَبَیْنَھُمْ مِّیْثَاقٌ وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ۝

اور جو لوگ ایمان تو لائے مگر ہجرت کر کے تمہارے پاس نہیں آئے۔ ان کی ولایت کا کوئی تعلق تم سے نہیں ہے۔ جب تک کہ وہ ہجرت کر کے نہ آجائیں۔ البتہ اگر وہ دین کے معاملہ میں تم سے مدد مانگیں تو مدد کرنا تم پر واجب ہے مگر کسی ایسی قوم کے خلاف نہیں جس کے اور تمہارے

---

[1] ترجمان القرآن۔ جون ۱۹۴۸ء

درمیان معاہدہ ہو۔ اور اللہ دیکھتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔

مولانا کی رائے سے جن لوگوں نے اختلاف کیا۔ ان میں سے بعض کے پیشِ نظر تو فقط قوم کی "دنیوی مصلحتیں" تھیں لیکن علما نے بھی بالعموم ان سے اختلاف کیا اور کہا کہ مولانا اس آیت سے اِستدلال کرتے وقت اس وقت نظر کو کام میں نہیں لائے جو مختلف اور زیادہ پیچیدہ حالات میں ایک حکم کے صحیح اطلاق کے لئے ضروری ہے۔ مولانا کی بنیادی غلطی یہ تھی کہ وُہ ان معاہدات کی بنا پر جو حکومتِ ہندوستان سے دوسرے شعبوں میں ہوئے، پاکستان کو پابند سمجھتے تھے کہ وُہ اس مسئلے میں بھی جس کے متعلق کوئی معاہدہ نہیں بلکہ علانیہ اختلاف ہے، مخالفانہ کارروائی نہ کرے۔ وُہ یہ کہتے تھے کہ "دو قوموں کے درمیان چند معاملات میں معاہدانہ تعلق اور ایک یا دو معاملوں میں جنگ کا قیام ایک ایسی متناقض بات ہے جس کا کوئی معقول آدمی تصوّر نہیں کر سکتا"۔ واقعہ یہ ہے کہ عہدِ نبویؐ میں یہی حالت تھی حکومتوں کے درمیان "معاہدانہ تعلقات" کی صورت میں دشمنی کی گنجائش نہ ہوتی تھی، لیکن اب بین الاقوامی تعلقات اس قدر پیچیدہ ہو گئے ہیں کہ شاید اس زمانے میں جب حکومت برطانیہ اور جرمنی میں باقاعدہ جنگ ہو رہی تھی اور فریقین کے ہوائی جہاز بمباری سے ایک دُوسرے کے وجود کو صفحۂ ہستی سے نابود کرنے کی کوشش کر رہے تھے، اس وقت بھی کئی معاملات ایسے تھے جن میں ان کے آپس میں معاہدے تھے۔ اور بالخصوص کئی بین الملّی معاہدات (INTER NATIONAL CONVENTIONS -) ایسے ہوں گے (مثلاً کاپی رائٹ، زہریلی گیس کے متعلق معاہدہ" RED CROSS CONVENTIONS - وغیرہ) جن پر دونوں کے دستخط تھے اور دونوں حکومتیں عامل تھیں۔ اہلِ پاکستان نے بھی دیکھا ہوگا کہ مغربی جرمنی سے پاکستان کی تجارت ۱۹۴۹ء کے آخر سے باقاعدہ ہو رہی تھی لیکن جرمنی سے اختتامِ جنگ کا اعلان جنوری ۱۹۵۱ء میں ہوا۔ اور جرمنی اور امریکہ کے درمیان تو اس کے بعد قانونی طور پر جنگ کی حالت رہی لیکن تجارت جاری تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر واقعات کو فقط اہلِ معقولات کی منطق اور مُلّایانِ مکتب کی عینک سے دیکھیں۔ تو یہ صورتِ حالات ضرور عجیب معلوم ہوتی ہے لیکن عملی زندگی ایک بڑی پُر پیچ وادی ہے۔ اس میں عجیب و غریب حالات اور

پیچ در پیچ مشکلات سے سابقہ پڑتا ہے۔ ہاں اگر حقیقت کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں اور زندگی کو فقط مدرسانہ منطق کی روشنی میں دیکھیں تو واقعات کا اندازہ کچھ سے کچھ ہوتا ہے۔

مولانا کی رائے سے جن علما نے اختلاف کیا۔ ان میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی شخصیت بلحاظ علم و فضل و تقویٰ سب سے بلند تھی۔ ان کے علاوہ مولانا محمد نور الحق علوی اور متعدد بزرگوں نے بھی مولانا کے فتوے سے شرعی دلائل کی بنا پر اختلاف کیا۔ بلکہ "بعض خطیب صاحبان نے تو مسجدوں کے منبروں پر چڑھ کر لوگوں کو مولانا کے قتل پر ابھارا[1]"۔ اخبارات نے بھی عام طور سے مولانا کی رائے پر شدید نکتہ چینی کی۔ اور حکومت کو مشورہ دیا کہ ان کے خلاف کارروائی کی جائے۔

جمہور کی مخالفت سے مولانا متاثر نہ ہوئے۔ ان کا فرمانا تھا:۔

ایسی رائے عام کی تائید میرے لئے ذرّہ برابر بھی مفید نہیں ہے جو نعرہ تو اسلامی حکومت کا لگائے۔ مگر جب اس کی خواہش کے خلاف کوئی حکم شرعی اُسے سنایا جائے۔ تو وہ اس پر چیں بہ جبیں ہی نہ ہو بلکہ کہنے والے پر لعنت ملامت کی بوچھاڑ شروع کر دے[2]"

لیکن جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ جمہور کے تاثرات سے اس درجہ بے پروانہ تھی۔ اور مولانا پر برابر زور ڈالا جارہا تھا کہ اپنی رائے میں ترمیم کریں۔ چنانچہ ۱۵۔ ۱۶۔ ۱۷ ستمبر کو جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ کا جو جلسہ ہوا اس میں حسب ذیل قرار داد منظور ہوئی:۔

"امیر جماعت نے اپنے پچھلے بیانات میں جو شرعی مسئلہ بیان کیا تھا وہ اس حالت سے متعلق تھا جب کہ سرکاری طور پر اس امر کا کوئی اقرار و اظہار نہیں ہوا تھا کہ پاکستان کی فوجیں حدود کشمیر میں موجود ہیں۔ اب ۷ ستمبر کو مجلس اقوام متحدہ کے کشمیر کمیشن سے حکومت پاکستان کی جو مراسلت شائع ہوئی ہے اور روز وزیر خارجہ پاکستان نے ۸ ستمبر کو جو بیان دیا ہے اس میں اس امر کا واضح اقرار و اظہار موجود ہے اور حکومت ہند بھی اس پر مطلع ہو چکی

---

[1] "مولانا مودودی کی نظر بندی" (شعبہ نشر و اشاعت اسلامی جماعت) (ص ۱۱)

[2] ترجمان القرآن بابت ماہ جون ۱۹۴۸ء

ہے۔ اس بنا پر اس کا شرعی حکم بھی وہ نہیں ہوگا جو پہلے تھا.... اس انکشاف کے بعد امیر جماعت اور مجلسِ شوریٰ کی متفقہ رائے یہ ہے کہ اب معاہدانہ تعلقات کے باوجود پاکستان کے لئے جہادِ کشمیر میں جنگی حصہ لینا بالکل جائز ہے"[1]

معلوم ہوتا ہے کہ مجلسِ شوریٰ کے اراکین نے مولانا کو اپنی رائے بدلنے پر مجبور کیا۔ ورنہ کمیشن کی مراسلت کی اشاعت سے وہ شرائط پوری نہیں ہوئی تھیں۔ جن پر مولانا کو اصرار تھا۔ مجلسِ شوریٰ کے اجلاس سے بارہ تیرہ روز پہلے مولانا نے توضیحی مضمون میں کہا تھا:۔

"...... لیکن جب تک حکومتِ ہند اور حکومتِ پاکستان کے درمیان معاہدانہ تعلقات قائم ہیں۔ میں براہِ راست جنگی کارروائی میں ان کی شرکت کو جائز نہیں سمجھتا۔ شریعت کے احکام میری دانست میں یہی ہیں۔ اور اس کے خلاف جو دلائل پیش کئے گئے ہیں۔ ان سے میرا اطمینان نہیں ہو سکا۔"[2]

ترجمان القرآن میں بھی انھوں نے لکھا تھا:۔

"دو قوموں کے درمیان چند معاملات میں معاہدانہ تعلق اور ایک یا دو معاملوں میں حالتِ جنگ کا قیام ایک ایسی متناقض بات ہے جس کا کوئی معقول آدمی تصور نہیں کر سکتا۔ معاہدانہ تعلقات خواہ کسی نوعیت کے ہوں بہر حال اس امر کو مستلزم ہیں کہ دونوں قومیں ایک دوسرے کے خلاف جنگی کارروائی نہیں کریں گی۔ کسی امر میں اگر ان کے باہم نزاع ہو تو جب تک معاہدانہ تعلقات قائم ہیں۔ اس نزاع کو پُرامن طریقہ ہی سے سلجھانے کی کوشش کی جائے گی۔ اور اگر وہ کسی طرح نہ سلجھ سکے تو جنگ کا فیصلہ کرنے سے پہلے ان تمام دوستانہ تعلقات کو ختم کرنا ہوگا جو ان کے درمیان قائم تھے۔"[3]

ظاہر ہے کہ اس امر کے تسلیم کر لینے سے کہ کشمیر میں پاکستان کی فوجیں ہیں۔ دوسرے معاملات میں حکومتِ ہند اور حکومتِ پاکستان کے درمیان "معاہدانہ تعلقات" ختم نہیں ہو گئے تھے۔ بلکہ وزیرِ خارجہ کے اعلان سے "چند

---

[1] ملاحظہ ہو رسالہ "مولانا مودودی کی نظربندی" (شعبہ نشر و اشاعت اسلامی جماعت ص ۱۲) د

[2] رسالہ "مولانا مودودی کی نظربندی" ص ۱۰ [3] ترجمان القرآن بابت جون ۱۹۴۸ء

معاملات میں معاہدانہ تعلق اور ایک یا دو معاملوں میں حالت جنگ کا قیام" سے وہ "متناقض بات" پیدا ہو گئی تھی جس کا بقول مولانا" کوئی معقول آدمی تصوّر نہیں کر سکتا"۔

حقیقت یہ ہے کہ مجلس شوریٰ کی رائے کے زیرِ اثر مولانا کو اپنی رائے بدلنی پڑی۔ علانیہ ایک بڑی غلطی کو تسلیم کرنا مولانا اور جماعتِ اسلامی دونوں کی شہرت کو ٹھیس لگاتا۔ اس لئے یہ شرعی حیلہ ڈھونڈا گیا کہ مراسلت کی اشاعت کے بعد صورتِ حالات بدل گئی ہے۔ اب شرعی حکم بھی مختلف ہے۔ غالباً مجلسِ شوریٰ کو امید تھی کہ اس فیصلہ کے بعد حکومت اور عوام کی شکایات دونوں کے دل سے دُھل جائیں گی۔ مگر جس انداز سے کئی مہینوں تک مولانا ایک نہایت نازک مسئلہ میں اپنی مفسدانہ رائے پر جمے رہے۔ اور پھر اس کے علاوہ وہ جس طریقے سے سرکاری ملازموں کو حلفِ وفاداری سے باز رکھ رہے تھے۔ اس کے پیشِ نظر حکومت نے یہ فیصلہ کیا کہ اُن کی کوششیں ملک کی سلامتی کے لئے مضر ہیں۔ اور ۴ اکتوبر ۱۹۴۸ء کو انہیں اور ان کے دو رفقائے کار کو نظر بند کر لیا گیا۔

فوجی بھرتی اور جماعت اِسلامی حلفِ وفاداری اور جہادِ کشمیر کے علاوہ حکومت اور جماعت کے درمیان کشیدگی کا تیسرا سبب فوجی بھرتی کے متعلق جماعت کا نقطۂ نظر تھا۔

اِسلامی جماعت سے عام مسلمانوں کو بڑی شکایت یہ تھی کہ "[1] جب تک انگریزوں کی حکومت تھی تو مودودی صاحب کے ہمدرد و معاون اور معتقد سرکاری افسر اور اہل کار انگریزی حکومت کی وفادارانہ خدمت کرتے رہے اور مودودی صاحب نے انہیں اس سے نہ روکا۔ نمائشی پراپگنڈا دوسری چیز ہے۔ مگر کوئی شخص اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ گورنمنٹ آف انڈیا کے بعض اعلیٰ افسر مودودی صاحب کے معاون و سرپرست تھے۔ اور مودودی صاحب کو ان سے مالی اعانت بھی ملتی رہی۔ حیرت ہے کہ جب تک انگریزی راج تھا مودودی صاحب نے نہ تو یہ فتویٰ دیا کہ لڑائی کے لئے فوج میں بھرتی حرام ہے اور نہ یہ اعلان کیا کہ میرے معاونوں اور مریدوں کو انگریزی حکومت سے بغاوت کا اعلان کر دینا چاہیئے۔" لیکن پاکستان میں آکر انہوں نے اپنا معیار کچھ اس ڈھنگ کا بنایا۔ کہ

---

[1] نوائے وقت ۳ ستمبر ۱۹۴۸ء

پاکستان کے انتہائی مشکلات کے دور میں بھی قدم قدم پر ان کا حکومت سے تصادم ناگزیر ہو گیا۔ اب وہ اس امر پر مصر تھے کہ جب تک حکومت اسلامی نہ ہو جائے اس کے ساتھ پوری وفاداری بلکہ اس کی فوجی ملازمت بھی ممنوع ہے۔ "حلفِ وفاداری" کے مسئلہ پر حکومتِ پنجاب سے ان کی چپقلش اسی بنا پر ہوئی۔ اور فوجی بھرتی کا قضیہ بھی اسی وجہ سے پیش آیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ فوج میں جماعتِ اسلامی کے ارکان کی شمولیت پر مجلسِ شوریٰ نے ۱۰ اپریل ۱۹۴۸ء کے اجلاس میں کوئی فیصلہ کیا تھا۔ جس کی روشنی میں قیم جماعت نے چند ماہ بعد ایک خط کے جواب میں لکھا کہ "موجودہ حکومتِ پاکستان غیر اسلامی ہے۔ اس لئے ہم مسلمانوں کو اس کی فوج یا ریزرو دستوں میں بھرتی ہونے کا مشورہ نہیں دے سکتے[1]"

جب اس پر اخبارات میں لے دے ہوئی تو قائم مقام امیرِ جماعت (مولانا عبدالجبار غازی) نے کہا کہ یہ احکام ارکانِ جماعت کے لئے ہیں عوام کا مسئلہ ان کی صوابدید پر ہے۔

"ارکانِ جماعت کے لئے ہماری یہ ہدایت یہ ہے کہ وہ اپنی توجہات کو اصلاً اقامت دین کی جدوجہد پر مرتکز رکھتے ہوئے دفاع کے مختلف کاموں کی تربیت حاصل کرنے میں پورا پورا حصہ لیں۔ عملاً دفاع کی ضرورت پیش آجانے پر ارکان کو بھی بہر حال فوج کے اندر شامل ہو کر ہی فرض ادا کرنا ہو گا۔ لیکن فوج میں تنخواہ دار ملازم کی حیثیت سے ان کو شمولیت کا مشورہ ہم صرف اس صورت میں دے سکتے ہیں جب کہ حکومت ریاست اور فوج کے اسلامی ہونے کا دستوری اعلان کر کے گومگو کی موجودہ حالت کو ختم کر دے[2]۔"

چونکہ اس خط میں ارکانِ جماعت کو بعض شرائط پورے ہونے تک فوجی ملازمت سے باز رہنے کی ہدایت تھی اس لئے حکومت نے جماعتِ اسلامی کے رسالہ "جماعتِ اسلامی اور دفاعِ پاکستان" کو جس میں اس طرح کا اظہار تھا ضبط کر لیا۔ قومی اخبارات نے بھی اس پر کڑی نکتہ چینی کی۔ بالخصوص "نوائے وقت" نے متعدد

---

[1] نوائے وقت ۳۱ اکتوبر ۱۹۴۸ء [2] ملاحظہ ہو رسالہ "مولانا مودودی کی نظر بندی" ص ۱۵

مقالے لکھے اور بتایا کہ جماعت اسلامی پاکستان کی بنیادیں کھوکھلی کرنے پر تُلی ہوئی ہے۔ ایک مقالے کا عنوان تھا "فوج کے بغیر دفاع"۔ اس میں لکھا تھا:

"جماعت کے ارکان یہ کہتے ہیں کہ جہاں تک دفاعی سرگرمیوں کا تعلق ہے وہ حکومت کے ساتھ تعاون کے لئے آمادہ ہیں مگر حکومت کی فوج اور ریزرو آرمی میں بھرتی کا مشورہ دینے سے وہ معذور ہیں۔ یہ پوزیشن بے حد احمقانہ اور خطرناک ہے سوال یہ ہے کہ فوج کے بغیر ملک کے دفاع کی کیا تدبیر ممکن ہے اور وہ کون سی حکومت ہے جو فوج یا ریزرو آرمی کے بغیر ملک کو دشمن سے بچا سکتی ہے۔"

ایک اور مقالہ کا عنوان تھا "مسئلہ دفاع اور فوجی بھرتی"۔ اس میں بھی انہی خیالات کا اظہار تھا لیکن اس سے بھی زیادہ تفصیلی بحث ۲۹ اکتوبر ۱۹۴۸ء کے ایک ایڈیٹوریل میں کی گئی جس کے اختتام پر ایڈیٹر نے لکھا:۔

"افسوس صد افسوس کہ ہندوستان میں تو مولانا حسین احمد مدنی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حفظ الرحمن اور مولانا احمد سعید مسلمانوں کو یہ مشورہ دے رہے ہیں کہ وہ حکومتِ ہند سے دل و جان کے ساتھ تعاون کریں۔ مگر پاکستان میں اسلامی حکومت اور اسلامی نظام کے داعیوں کا یہ طائفہ مسلمانوں کو یہ مشورہ دے رہا ہے کہ موجودہ حکومت غیر اسلامی اور موجودہ نظام کافرانہ ہے۔ لہذا دین میں تحریف کئے بغیر اس سے تعاون ناممکن ہے۔ گویا اگر اس عدم تعاون کے طور پر خدانخواستہ پاکستان ختم ہو جائے تو پھر یہاں اسلامی نظام رائج ہو جائے گا۔

جماعتِ اسلامی ہندوستان میں بھی ہے اور اس کے امیر بھی مودودی صاحب ہی ہیں۔ یہ کیا بات ہے کہ ان کے سارے فتوے پاکستان کے لئے ہی وقف ہیں؟

بندہ پرور! آپ غدار اور دشمن کے ایجنٹ نہیں ہوں گے مگر خود ہی انصاف فرمائیے۔ غدار اور دشمن کے ایجنٹ پاکستان کو اس سے زیادہ کیا نقصان پہنچا سکتے ہیں؟"

راستی باعث رضائے خداست

گذشتہ باب میں ہم نے جماعتِ اسلامی اور حکومتِ پاکستان کے درمیان کشمکش کے جو اسباب بیان کئے ہیں وہ اصولی اور نظری بنیادوں پر مبنی تھے لیکن حکومت اور جماعت کے درمیان سخت کشیدگی اور تلخی کا ایک اہم سبب ایسا بھی تھا جسے اصولی باتوں سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ یہ سبب حکومتِ پاکستان کے خلاف جماعت کا مسلسل اور بعض موقعوں پر سخت مبالغہ آمیز اور غیر منصفانہ پراپاگنڈا تھا۔

مسلمانوں کی قیادتِ عظمیٰ پر ترجمان القرآن کی نکتہ چینی

قیامِ پاکستان کے بعد حکومت نے جماعتِ اسلامی سے جو ہمدردانہ برتاؤ کیا اس کا ہم ذکر کر چکے ہیں۔ لیکن زبانی گفتگو[1] اور تحریر اور تقریر میں مسلم لیگ اور حکومتِ پاکستان پر اسلامی جماعت کی نکتہ چینیاں اسی طرح جاری رہیں جس طرح قیامِ پاکستان سے پہلے تھیں بلکہ چونکہ مودودی صاحب کا علانیہ مقصد "حکومت کی مشین پر قبضہ کرنا تھا"[2]۔ اس مقصد کے لئے حکومتِ وقت کو عوام کی نظروں میں گرا دینا بہترین طریق کار سمجھا گیا۔ اور زبانی گفتگو کے علاوہ جماعت کے رسائل و اخبارات میں حکومت کے

---

[1] آج نواب صاحب ممدوٹ اور جماعت اسلامی کے درمیان (مرکز کی مخالفت کی بنا پر) اشتراکِ عمل کی تجویزیں ہو رہی ہیں لیکن پاکستان میں آنے کے بعد مولانا نے نواب صاحب سے پہلی ملاقات کے بعد جن خیالات کا اظہار کیا وہ میاں طفیل محمد صاحب قیم جماعت اسلامی کی زبانی سُنئے جو قاصد کے کشمیر نمبر میں فرماتے ہیں:۔

"مولانا کا تاثر یہ تھا کہ برسر اقتدار گروہ اس قدر خود غرضی میں مبتلا ہے کہ اگر کبھی اُسے اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کے لئے پوری قوم کو خطرے میں ڈالنے کی ضرورت پیش آئی تو وہ اس سے بھی باز نہ رہے گا۔"

---

[2] ترجمان القرآن دسمبر ۱۹۳۷ء

خلاف سخت ترین نکتہ چینی ہوئی۔ اور سنگین ترین الزام لگائے گئے ترجمان القرآن فکری مباحث کے لئے مخصوص ہے! اور عام طور پر اس سطح پر نہیں اُتر آتا جس پر کوثر۔ تسنیم۔ جہانِ نو اور جماعت کے دوسرے اخبارات ہیں۔ لیکن ترجمان القرآن کا وہ پہلا نمبر پڑھیئے جو قیامِ پاکستان کے بعد شائع ہوا۔ اس میں سات مضامین تو ایسے ہیں جو پہلے ایک سرکاری ادارہ ریڈیو پاکستان پر تقریری صورت میں نشر ہوئے اور باقی تین حکومت کی مخالفت پر مبنی ہیں۔ ان میں سے دو حلفِ وفاداری، اور جنگ کشمیر کے متعلق ہیں جن کا ہم ذکر کر چکے۔ تیسرا ایڈیٹوریل ہے جس کی تان اس بات پر آکر ٹوٹتی ہے کہ مسلمانوں کی قیادتِ عظمیٰ[1] سے زیادہ نالائق اور قوم کے لئے مضر کوئی دوسری چیز نہیں ہوسکتی ایڈیٹوریل میں ایک عمومی تبصرے کے بعد مولانا نے سیاسی ڈرامہ کے تین اداکاروں یعنی انگریزوں۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے کام کا جائزہ لیا ہے۔ اس میں وہ مسلمانوں کی "قیادتِ عظمیٰ" کے متعلق فرماتے ہیں:۔

"اب تیسرے اداکار کو لیجئے جس کا پارٹ اس ڈرامہ میں سب سے زیادہ ناکام رہا ہے۔

دس سال سے مسلمانوں کی "قیادتِ عظمیٰ" جس لائحہ عمل پر چل رہی تھی وہ سلطان عبدالحمید خاں کی سیاست سے ملتا جلتا تھا۔ جس طرح وہ ۳۳ سال تک محض دول یورپ کی باہمی رقابتوں سے فائدہ اٹھا کر جیتے رہے اور اس دوران میں خود ٹرکی کی کوئی طاقت اُنہوں نے نہ بنائی جس کے بل بوتے پر وہ جی سکتا اسی طرح اس قیادت کا بھی سارا سیاسی کھیل بس انگریز اور کانگریس کی کش مکش سے فائدہ اٹھانے تک محدود تھا۔ پورے دس سال میں اس نے خود اپنی قوم کی اخلاقی، مادی، اور تنظیمی طاقت بنانے اور اس کے اندر قابلِ اعتماد سیرت پیدا کرنے کی کوئی کوشش نہ کی جس کی بنا پر وہ اپنے کسی مطالبہ کو خود اپنی طاقت سے منوا سکتی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ جونہی انگریز اور کانگریس کی باہمی کشمکش ختم ہوئی، اس قیادتِ عظمیٰ نے اپنے آپ کو ایسی حالت میں پایا جیسے اس کے پاؤں تلے زمین نہ ہو اب وہ مجبور ہوگئی کہ جو کچھ جن شرائط پر بھی ملے اسے غنیمت سمجھ کر قبول کرلے بنگال و پنجاب کی تقسیم اسے بے چون و چرا ماننی پڑی۔ سرحدوں کی تعیین جیسے نازک مسئلہ کو اسے صرف ایک شخص پر چھوڑ دینا پڑا۔ انتقالِ اختیارات کے لئے جو وقت اور جو طریقہ تجویز کر دیا گیا اُسے بھی بلا تامل اُس نے مان لیا۔ حالانکہ یہ تینوں امور صریح طور پر مسلمانوں

---

[1] قائدِ اعظم اس وقت زندہ تھے۔

کے حق میں مہلک تھے۔ انہی کی وجہ سے ایک کروڑ مسلمانوں پر تباہی نازل ہوئی اور انہی کی وجہ سے پاکستان کی عمارت اول روز ہی سے سخت متزلزل بنیادوں پر اُٹھی۔"

دنیادار سیاسی جماعتوں کا وطیرہ ہے کہ وہ جماعتی مفاد کی خاطر بسا اوقات مخالف جماعتوں کی خوبیوں اور نیک کاموں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اور ان کی غلطیوں اور کوتاہیوں کو بڑھا چڑھا کے بیان کرتی ہیں لیکن ایک ایسی جماعت سے جو دینی نظام کی ترجمان ہو اور "صالحیت" پر بڑا زور دے۔ یہ توقع ہو سکتی ہے کہ وُہ مخالفین پر نکتہ چینی کرتے وقت انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ دے گی۔ اور جو کچھ کہے گی خوفِ خدا سے بیگانہ ہو کر نہ کہے گی۔

مولانا مودودی کے نزدیک اس برّاعظم کے سیاسی ڈرامہ میں سب سے ناکام "پارٹ" مسلم لیگ کا تھا یعنی ان کی نظر میں وہ جماعت جس نے سیاسی اقلیت ہونے کے باوجود دس برس کی قلیل مدت میں (مولانا اور دوسری مقدس ہستیوں کی مخالفت کے باوجود) دنیا کی پانچویں بڑی اور موجودہ اسلامی دنیا کی سب سے عظیم الشان سلطنت قائم کر لی (گو اس کوشش میں اسے مسلم اکثریت کی چند بیش قیمت تحصیلوں سے ہاتھ دھونا پڑا) وہ تو ناکام ہے۔ لیکن وُہ قومی ادارہ جو ساٹھ ستر سال سے مصروفِ عمل تھا۔ جس کی پشت پر بے پناہ ذہنی قابلیت، دولت، تنظیم اور ایثار تھا۔ اور جس نے حصولِ مدعا کی خاطر ایک مدتِ مدید تک قوم سے ایسی قربانیاں کرائیں جن کی صفحۂ ہستی پر نظیر نہیں۔ اور ان سب کے باوجود ہندوستان کی آزادی کے وقت جب اس کی چاہیتی لیبر پارٹی برسرِ اقتدار تھی۔ ملک کا پانچواں حصہ اور وہ علاقے جن پر اس کی مدافعت، تجارت، صنعت بلکہ عوام کے پیٹ پالنے کا انحصار تھا کھو دیئے وہ کامیاب! اور دنیا کی وہ عظیم الشان طاقت جسے ہندوستان اور پاکستان دونوں سے ہاتھ دھونا پڑا وُہ اس سے بھی زیادہ کامیاب!

خیر اپنی اپنی رائے ہے اور اپنا اپنا خیال لیکن انصاف کا تقاضا تھا کہ جہاں مولانا نے "مسلمانوں کی قیادتِ عظمیٰ" کی کوتاہیاں گنوائیں۔ وہاں رسمی طور پر بر سبیلِ تذکرہ ہی سہی۔ اس بات کا بھی ذکر کر دیتے کہ پاکستان کے حصول میں اس "ناکام" قیادت کا کچھ حصہ تھا۔

اگر مولانا اس مسئلے پر قلم اٹھاتے وقت انصاف کو مدِ نظر رکھتے تو شاید انہیں یہ بھی نظر آجاتا کہ انہوں نے جن مشکلات اور مجبوریوں کا ذکر کیا ہے وہ "قیادتِ عظمیٰ" کی کوتاہیوں سے پیدا نہیں ہوئیں۔ بلکہ بنیادی صورتِ حالات کا لازمی اور قدرتی نتیجہ تھیں ـــــــــــــــ ـــــــــــــــ ایک طرف تیئیس کروڑ انسان ہیں دوسری طرف ان کی ایک چوتھائی سے بھی کم۔ ایک طرف دولت و ثروت۔ تجارت و حرفت کا طغیان ہے دوسری طرف اس کا چالیسواں حصہ بھی نہیں۔ ایک طرف جدید تعلیم ہے۔ بیرونی ممالک میں برسوں کا پراپاگنڈا ہے اور ستر سال کی جماعتی کوششیں ہیں دوسری طرف "برات عاشقان بر شاخِ آہو" کا منظر ہے۔ اور ستم بالائے ستم یہ کہ مستقبل کا فیصلہ اس وقت ہو رہا ہے جب انگلستان میں برسرِ اقتدار جماعت وہ ہے جو برسوں سے کانگریس کی ہم نوا رہی ہے۔ جو علانیہ اس امر کا تہیہ کر چکی ہے کہ کانگریس کی خوشنودی کے ساتھ ہندوستان سے اپنا اقتدار اٹھائے گی۔ اس وقت وزیرِ ہند وہ بزرگ ہیں جو اس سے بیس سال پہلے آل انڈیا کانگریس کے کھلے اجلاس میں شریک ہو چکے ہیں۔ جن کا مقصدِ حیات ہندوستان کو فوری آزادی دلانا ہے۔ وائسرائے (لارڈ ویول) اگر واقعات کی رفتار کو ذرا آہستہ کرنا چاہتا ہے اور کانگریسی وزرا اس کی شکایت کرتے ہیں تو اسے بیک جنبشِ قلم نکال باہر کیا جاتا ہے۔ اور ایک نئے وائسرائے کو (جو جواہر لال نہرو کا پرانا دوست ہے) اس صریح ہدایت کے ساتھ بھیجا جاتا ہے کہ جس طرح ہو سکے اکثریت کی خوشنودی کے ساتھ۔ چار مہینوں کے اندر اندر ہندوستان خالی کرنے کا انتظام کرو۔ ...

یہ تھی صورتِ حالات جس میں مسلمانوں کی "قیادتِ عظمےٰ" کو بعض تلخ فیصلے کرنے پڑے[1]۔ یہ بالکل غلط ہے کہ انتقالِ اختیارات کے لئے جو وقت اور جو طریقہ تجویز کر دیا گیا اسے بلا تامّل اس نے مان لیا۔ قائدِ اعظمؒ اور عارضی

---

[1] فلسطین کے عربوں کو بھی ایک ایسی طرح کا مرحلہ پیش آیا تھا لیکن ان میں قائدِ اعظمؒ جیسا کوئی راہنما نہ تھا جو ایک تلخ فیصلہ کی ذمہ داری قبول کر لیتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تقسیمِ فلسطین کی ابتدائی تجویز انہوں نے ٹھکرا دی اور بعد میں انہیں اس سے بھی بہت کم رقبہ ملا۔ پانچ چھ لاکھ مہاجرین کا بار سر پہ علیحدہ پڑا۔ اور تمام دنیا پر ان کا اور دوسرے عرب ممالک کی طاقت کا جو پول کھلا وہ اس پر مستزاد۔

حکومت کے لیگی وزرا نے اس میں تغیر و تبدل کی پوری کوشش کی لیکن جب انہیں لیبر گورنمنٹ کے دو ٹوک فیصلہ سے دوچار ہونا پڑا۔ تو انہوں نے طے کیا (اور درست طے کیا) کہ انگریزوں کے سامنے ان کی موجودگی میں جو تصفیہ ہو وہ اس سے کہیں بہتر ہوگا جو ان کے چلے جانے کے بعد مسلمان اپنے زور بازو سے منوا سکیں گے۔

یہ فیصلہ تو اہل انصاف ہی کر سکتے ہیں کہ مسلمانوں کی "قیادت عظمیٰ" ایک اور چار کے تناسب اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان دولت تعلیم اور اثر میں بھی اس سے زیادہ تفاوت کو کس طرح بدل سکتی تھی۔ لیکن یہ کہنا سراسر بہتان ہے کہ اس قیادت نے "پورے دس سال میں خود اپنی قوم کی اخلاقی۔ مادی اور تنظیمی طاقت بنانے کی" کوشش نہیں کی حقیقت یہ ہے کہ قائد اعظمؒ نے اس سلسلہ میں دس سال میں جو کچھ کر دکھایا وہ ایک معجزہ سے کم نہ تھا یہ ان کی تنظیمی کوششوں کا کرشمہ تھا کہ جب ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ ہونے کو آیا تو علمائے کرام کو چھوڑ کر ہندوستان کے مسلمان اس طرح متحد تھے کہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئے۔ علما کی مخالفانہ کوششوں کے باوجود اس وقت قومی تنظیم کی یہ حالت تھی کہ اس الیکشن میں جس پر قوم کے مستقبل کا انحصار تھا سنٹرل لیجسلیٹو اسمبلی میں ایک سیٹ بھی جو مسلمان ووٹوں کی رائے سے پُر ہوتی تھی۔ مخالف فریق کو نہ مل سکی۔ پنجاب میں مسلم لیگ کو سو فی صدی کامیابی نہ ہوئی۔ لیکن اس صوبہ میں بھی مسلمانوں کی نوّے فی صدی سیٹیں لیگ نے حاصل کیں۔ یونینسٹ وزارت اور حکام کے خلاف یہ کامیابی معجزہ سے کم نہ تھی۔ اور قوم کی تنظیمی حالت کا ثبوت تھی۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ قائد اعظمؒ سے غلطیاں نہیں ہوئیں لیکن (ایک تو ان غلطیوں کے گنوانے کا حق علمائے کرام کے مقدس گروہ کو اس وقت ہوتا جب اُن سے اس نازک مرحلے پر سوائے غلطیوں کے اور پاکستان کی راہ میں روڑے اٹکانے کے اور کچھ بن آتا۔ اس کے علاوہ) اگر واقعات کو ٹھنڈے دل سے دیکھیں تو از روئے انصاف کہنا پڑتا ہے کہ قائد اعظمؒ اور عام مسلمانوں نے اس نازک موقع پر غیر معمولی تدبّر تنظیم اور فہم و فراست کا ثبوت دیا جو بپتا ہندوستان کے مسلمانوں پر پاکستان کے قیام کے بعد پڑی۔ اس کا آئینی فیصلہ سے کوئی

تعلق نہیں۔اگر کل کو خدانخواستہ اشتراکی روس سے ترکی نسل کے سارے مسلمان جلاوطن کر دیئے جائیں۔یا ان میں سے بہت سوں کو قتل کر دیا جائے یا ان کے گھر بار لوٹ لیئے جائیں تو اس کی ذمّہ داری ترکی حکومت پر نہیں ہوگی۔دوسری حکومت یا دوسری حکومت کے باشندوں کے جرائم کے لئے اپنی حکومت ذمہ دار قرار نہیں دی جاسکتی۔اس کے علاوہ غیر جانبدار حکومت کے چلے جانے کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کی حالت میں جو زوال ہوا۔وُہ اٹل تھا خواہ پاکستان بنتا یا نہ بنتا۔بلکہ اگر سر سیّد احمد خاں کی تحریریں پڑھیں تو نظر آئے گا کہ ہندوستان میں ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد مسلمانوں پر جو گزری وُہ اس بڈھے مدبّر کی دُوربین آنکھوں کو آج سے ستّر سال پہلے نظر آرہی تھی۔اسی لئے اس کی رائے تھی کہ ایک اقلیت کے لئے ایک مہذب اور غیر جانبدار حکومت غیر تربیت یافتہ اکثریت کی حکومت سے زیادہ مفید ہوتی ہے۔اور اس لئے اس نے انگریزوں کی وفاداری کی تلقین کی۔ہمارے مذہبی راہنماؤں نے اس نقطۂ نظر کی مخالفت کی[1]۔پھر الہلال کے آغاز کے بعد اور بالخصوص تحریکِ خلافت کے دوران میں مذہبی علما کے زیرِ اثر مسلمانوں کی سیاسی کوششیں کانگریس کی تحریک سے اس طرح ہم آہنگ ہوگئیں کہ اس تحریک کی کامیابی بہت آسان ہوگئی۔اور جو کام صدیوں میں ہونے والا تھا چند سالوں میں ہوگیا۔اسلامی ریاست کے اس مجذوبی دَور میں بھی چند ایک ہستیاں ایسی تھیں جنہوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنی بنیادی ضروریات فراموش نہ ہونے دیں۔اور مسلم لیگ کا کم از کم خالی خولی نظام برقرار رکھا۔پھر جب ۱۹۳۷ء میں فیصلہ کی گھڑی سامنے آئی تو قائدِ اعظمؒ نے قوم کی نئی تنظیم کر کے اسے آئندہ حالات کے لئے تیار کیا۔یہ انہی کی "قیادتِ عظمیٰ" کا معجزہ تھا کہ جب آخری فیصلہ کا وقت آیا تو اگرچہ ہندوستان کے بعض حصوں

---

[1] مولانا مودودی نے خود اس نقطۂ نظر پر جس شدومد سے نکتہ چینی کی ہے اس کے دیکھنے کے لئے سیاسی کشمکش حصہ اول ص ۲۸ ملاحظہ ہو۔ (اگرچہ مولانا کا یہ خیال غلط ہے کہ مسلمانوں کے سیاسی قائدین فقط انگریز پر بھروسہ کرتے تھے۔انہوں نے مسلمانوں کی تعلیم اور سیاسی تنظیم اور دوسرے حقوق کے تحفظ سے ان خطرات کا مقابلہ کرنے کے لئے قوم کو تیار کیا جو قوم کو انگریز کے جانے پر پیش آنے والے تھے۔لیکن وہ علمائے کرام کی طرح ہندوستانی مسلمانوں کے لئے انگریزوں کے قبل از وقت جانے کو ایک نعمتِ غیر مترقبہ نہیں سمجھتے تھے)

میں مسلمانوں پر وہ مشکلات آئیں جو ناگزیر تھیں۔ اور جن سے سر سید اور ان کے رفقائے کار شروع سے آگاہ کرتے آئے تھے۔ لیکن پھر بھی مسلمانوں کی بڑی اکثریت کو ان مصائب سے بچا لیا گیا۔ اور ان کے لئے ایک ایسا ملجا و ماویٰ مل گیا جہاں مسلمانوں کی وسیع ترین اکثریت آزادی سے اور اپنے خیالات کے مطابق زندگی بسر کر سکتی ہے بلکہ تمام عالمِ اسلام میں ایک نئی زندگی کی پیامبر بن سکتی ہے۔

جب لیبر گورنمنٹ کی پالیسی کے مطابق انگریز اور کانگریس کی کشمکش ختم ہوئی تو انگریزوں نے یکے بعد دیگرے ان تمام ساتھیوں سے کنارہ کشی شروع کی جن کو وہ اپنی مصلحتوں کی خاطر کانگریس کے خلاف استعمال کرتے رہے تھے۔ سب سے پہلے ڈاکٹر امبیدکر اور ان کی پارٹی سے کہہ دیا گیا کہ وہ جانیں اور کانگریس۔ اس کے بعد سکھوں کی باری آئی۔ ان کے لئے بھی کسی سکھ اسٹیٹ یا کسی اور تحفظ کا انتظام نہ ہوا۔ پھر ریاستی راجے مہاراجے اور نواب تھے جنہوں نے برطانوی حکومت کے لئے بے انتہا قربانیاں کی تھیں لیکن انہیں بھی نئی حکومت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا۔ ان تین پر جو گذری وہ اب تاریخ کا ایک باب ہے۔ یہ صرف قائدِ اعظمؒ کی اعلیٰ قیادت اور مسلمانوں کی تنظیم اور ہوش مندی کا نتیجہ تھا کہ وہ اس سیاسی تباہی سے بہت حد تک بچ گئے۔ جس سے دوسرے تین فریق دوچار ہوئے۔

ترجمان القرآن میں قائدِ اعظمؒ اور قیادتِ عظمیٰ پر جو الزامات لگائے گئے ہیں۔ وہ ہمارے خیال میں منصفانہ نہیں۔ لیکن ان مضامین اور حکومت کے خلاف مسلسل پراپاگنڈا کا اس سے بھی مضر اثر یہ ہوا کہ قیامِ پاکستان کے بعد جماعتِ اسلامی اور حکومت کے درمیان اشتراکِ عمل کے جو امکانات پیدا ہو گئے تھے۔ ان کو بڑی ٹھیس لگی۔

حکومت کے متعلق بے بنیاد الزامات ہمارے خیال میں مولانا کا ترجمان القرآن کا مذکورہ بالا مضمون انصاف اور مصلحت کے خلاف تھا لیکن اس مقالہ کے بعد اسلامی جماعت کے مختلف پرچوں میں حکومت اور ارکانِ حکومت پر جس طرح الزام لگائے گئے ہیں۔ ان میں انصاف اور دیانت داری کے معمولی اصولوں کو بھی نظر انداز

کر دیا گیا ہے ۔ مثلاً اسلامی جماعت کے ایک اخبار "تسلمان" کراچی میں ایک "تمثیلی افسانہ" شائع ہوا۔ عنوان تھا "کیبنٹ میٹنگ" اور اس میں "اسلامستان" کی مجلس وزراء کے ایک جلسہ کی فرضی روئداد تھی ۔ بظاہر تو یہ مضمون اسلامستان سے متعلق تھا ۔ مگر فی الحقیقت اس میں پاکستان کے وزراء کے سر فرضی معائب تھوپنے کی کوشش کی گئی تھی ۔ بلکہ نفسِ مضمون سے متاثر ہو کر کاتب نے ایک جگہ تو "اسلامستان" کے بجائے صاف طور پر لفظ "پاکستان" لکھ دیا ۔ اسلامستان کا دارالسلطنت "چکرائی" بتایا گیا ۔ جو ظاہر ہے "کراچی" کی مقلوب صورت ہے ۔ مضمون کا آغاز تھا :-

مملکت اسلامستان کے پایہ تخت چکرائی میں ایک عالی شان بلڈنگ ہے ۔ جس کے ایک آراستہ و پیراستہ کمرہ میں چند وزرائے مملکت ایک گول میز کے اطراف نہایت آرام دہ کرسیوں پر رونق افروز ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میز پر چند کاغذات کے سوا چند جام ہیں جن میں قدیم صد سالہ انگوری شراب جھلکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے ۔"

تمام مضمون میں اسی طرح کے فرضی اور بے بنیاد اتہامات ہیں ۔ مضمون کے آخر میں کہا گیا ہے :-

" وزیر داخلہ :- (ایک رنگین بوتل خالی کر کے میز پر زور سے پٹکتے ہوئے) معلوم ہوتا ہے ۔ چیونٹیوں کے پر نکل رہے ہیں ۔"

ان سطور میں اسلامستان (یعنی پاکستان) کے وزیر داخلہ سے "رنگین بوتل" کا انتساب ظاہر ہے ایک پابندِ صوم و صلوٰۃ مسلمان پر بہتان تھا ۔

اسی طرح کا بے بنیاد اتہام "تسلمان" ۔ "کوثر" اور "تسنیم" میں مسلم خواتین نیشنل گارڈز کے متعلق شائع ہوا ۔ جس میں کہا گیا تھا کہ :-

" ویمن نیشنل گارڈز کی کچھ لڑکیوں نے ڈاکٹری اور نرسنگ کے لئے اپنی خدمات پیش کیں اور جب ان کا معائنہ کیا گیا تو ان میں ۷۵ فی صدی ایسی پائی گئیں جن کا شیشۂ عصمت چور چور تھا ۔"

یہ خبر بالکل بے بنیاد تھی۔ جب حکومت پنجاب نے اس کے متعلق کوثر سے جواب طلب کیا تو اس اخبار نے بڑے معصومانہ انداز میں لکھا کہ اگر یہ خبر غلط ہے تو ہم اس کی تردید شائع کرنے کے لئے تیار ہیں۔ کوثر کے ایڈیٹر صاحب اسلامی نظام کے پُرجوش ترجمان ہیں۔ اور بہتان وتہمت کے متعلق اسلامی اخلاق کے تقاضے دنیاداروں کے اصولوں سے کہیں زیادہ کڑے ہیں۔ لیکن مغرب میں بھی (جو اسلامی جماعت کے نزدیک فقط برائیوں کا مجموعہ ہے) ذمہ دار صحافت کا یہ پہلا اصول ہے کہ جب ایک اخبار کوئی خبر شائع کرتا ہے تو یہ اس اخبار کی ذمہ داری ہے کہ وہ خبر کے صحیح ہونے کی تحقیق کرے۔ بالخصوص جب خبر بھی ایسی ہو کہ اس میں شریف خواتین پر پرلے درجے کے رکیک الزامات لگائے گئے ہوں اسلامی اخلاق میں اس طرح کے بہتان لگانے سے بدتر کوئی جرم نہیں لیکن حیرت ہے کہ اسلامی نظام کے ترجمان اخبارات نے یہ بہتان بغیر ذرّہ بھر تحقیق وتفتیش کے شائع کئے اور وہ معمولی احتیاط بھی نہ برتی جو مغربی اخبارات صحافت کے ادنٰے اصولوں کی بنا پر ضروری سمجھتے ہیں۔

کوثر وتسنیم میں یہ خبر مولانا مودودی کے ایام نظربندی میں شائع ہوئی تھی۔ ان کا اس کی اشاعت سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ حکومت کے متعلق الزامات لگانے میں وہ بھی اس احتیاط اور تامل سے کام نہیں لیتے جس کی مولانا جیسے پائے کے بزرگ سے توقع ہونی چاہیئے خان لیاقت علی خاں وزیر اعظم پاکستان کے امریکی دورے کے متعلق انہوں نے کراچی کے ایک جلسہ میں کہا کہ وزیر اعظم کے دورۂ امریکہ پر ۲۵ لاکھ خرچ آئے۔ خود شہیدِ ملّت نے کراچی کے جلسہ عام میں اس کی تردید کی اور کہا:۔

"یہاں ایک مولانا صاحب تشریف لائے۔ انہوں نے کہا میں نے اپنے دورۂ امریکہ پر پچیس لاکھ روپیہ صرف کیا ہے۔ اس الزام میں پانچ فی صدی بھی صداقت نہیں .... ہم

علما کا احترام کرتے ہیں۔ لیکن اگر علما ہی جھوٹ پر اتر آئیں تو ملت کا خدا حافظ[۱]۔"

اس پر مولانا نے ایک بیان دیا :-

"مسٹر لیاقت علی خاں وزیر اعظم پاکستان نے اپنی یوم آزادی کی تقریر میں اس بات کو جھوٹ قرار دیا ہے کہ ان کے دورۂ امریکہ پر ۲۵ لاکھ روپے خرچ ہوئے ہیں۔ میرے نزدیک ان کی یہ مبہم تردید بالکل ناکافی ہے۔ حکومت پاکستان کو ان کے دورے کا حساب شائع کرنا چاہیئے۔ اور صرف مجموعی صرف بتانے پر ہی اکتفا نہ کرنا چاہیئے بلکہ تفصیل کے ساتھ بتانا چاہیئے۔ کہ کن کن مدات پر کتنا کتنا خرچ کیا گیا۔ یہ اس لئے ضروری ہے کہ بہت سی مدات ایسی ہیں جو دراصل دورے کے خرچ سے تعلق رکھتی ہیں۔ مگر ان کو دوسرے حسابات میں ڈال کر دورے کے مجموعی خرچ کو باسانی کم دکھایا جاسکتا ہے۔"

ایک مسئلہ پر بحث جاری رکھنا ہمیشہ آسان ہوتا ہے لیکن انصاف اور عام اصولوں کا اقتضا یہ ہے کہ جب وزیر اعظم نے مولانا کے بیان کو غلط قرار دیا تو مولانا کو چاہیئے تھا کہ وہ ان شواہد کو پیش کرتے جن کی بنا پر انہوں نے فرمایا تھا کہ وزیر اعظم کے دورے پر پچیس لاکھ خرچ ہوا ہے اصل دعویٰ انہوں نے کیا تھا۔ اس لئے اس کا ثبوت پیش کرنے کی ذمہ داری از روئے انصاف ان ہی پر عائد ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ وزیر اعظم اور مولانا کے بیان میں اتنی وسیع خلیج ہے کہ وہ اگر پچیس لاکھ نہیں فقط پانچ لاکھ ہی کے متعلق کوئی قطعی شہادت پیش کر دیتے جس کی بنا پر انہوں نے بیان دیا تھا۔ تب بھی ان کے لئے حکومت کے بیان کو غلط ثابت کرنا آسان تھا۔

شاید اس سے بھی زیادہ قابل اعتراض طرز عمل جماعت کے اخبارات نے اختیار کیا۔ مولانا مودودی کی تقریر سے کچھ عرصہ پہلے کراچی کے ایک اخبار (فریڈم) میں یہ بیان شائع ہوا تھا۔ کہ وزیر

---

[۱] امروز ۱۷ اگست ۱۹۵۰ء

مالیات مسٹر غلام محمد نے ۲۵ لاکھ روپیہ کی ایک رقم کی منظوری سے انکار کر دیا جو ایک وزیر کے یورپ اور امریکہ کے دورہ پر صرف ہوئی تھی۔ یہ (غلط) اطلاع وزیر اعظم کے دورۂ امریکہ کے متعلق نہ تھی۔ "ایک وزیر" کا صاف ذکر تھا۔ لیکن حیرت اخبار قاصد[1] کے ایڈیٹر پر ہے کہ اس نے یہ جانتے ہوئے کہ 'فریڈم' کا مقالہ وزیر اعظم کی نسبت نہیں "ایک وزیر" کی نسبت ہے۔ اسے درج کرتے ہوئے بھی ناظرین کو گمراہ کرنے کی کوشش کی۔ اور جلی قلم سے ایسی سرخیاں دیں جن سے یہ خیال ہو کہ فریڈم کا مقالہ وزیر اعظم کے دورہ کی بابت ہے، "ایک وزیر" سے متعلق نہیں۔ یہ عنوانات ملاحظہ ہوں:۔

وزیر اعظم پاکستان کے دورۂ امریکہ کے اخراجات کی تفصیلات

لاہور کے مولوی صاحب نے بلاتحقیق الزام عائد نہیں کیا تھا۔

وزیر مالیات پاکستان نے ۲۵ لاکھ روپے کی منظوری سے صاف انکار کر دیا

کراچی کے ہفتہ وار اخبار فریڈم کا مقالہ

اس بحث سے بھی یہ خیال ہوتا ہے کہ اسلامی جماعت کے ذمہ دار اراکین تو کیا خود امیر جماعت حکومت کے خلاف الزامات لگاتے وقت کوئی تحقیق و تفتیش ضروری نہیں سمجھتے بلکہ ان کے عام اخبارات میں تو یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ بجائے کسی ٹھوس کام یا اپنے نقطۂ نظر کی صحت اور خوبی بیان کرنے کے، جماعت کا سارا زور حکومت پر صحیح یا غلط الزامات لگانے پر صرف ہوتا ہے اور افسوس تو یہ ہے کہ حکومت پاکستان کے خلاف یہ پراپاگنڈا اب پاکستان تک ہی محدود نہیں رہا جماعت کے شعبۂ عربیات کے متقد مولانا مسعود عالم ندوی کی کتاب "دیار عرب میں" ملاحظہ کیجئے اور دیکھئے کہ اس بزرگ نے جنہیں پاکستان کے ملازمین نے جابجا طرح طرح کی سہولتیں بہم پہنچائیں کس طرح اپنے دورے کو پاکستان کے خلاف پراپاگنڈا کرنے کے لئے وقف رکھا۔

اس کے علاوہ ہم اخبار تسنیم کی ایک خبر کو مثالاً پیش کرتے ہیں، اس کا تعلق اس "پولیس کارروائی"

---

[1] ۱۹۵۰ء میں جب تسنیم بند تھا۔ تو اس کی جگہ تھوڑے عرصے کے لئے قاصد نے جماعت اسلامی کی ترجمانی کی۔

سے ہے جو ہندوستان نے حیدر آباد کے خلاف کی تھی۔ یہ خبر کابل کے اخبار "انیس" کا افتتاحیہ ہے، اسے آل انڈیا ریڈیو نے نئی دہلی سے ۸ جولائی کو نشر کیا۔ ۱۰ جولائی ۱۹۴۹ء کو اخبار تسنیم نے اسے من وعن نقل کر کے چھاپا جلی قلم اس کا عنوان تھا "حیدر آباد کو یقین دلا دیا گیا تھا کہ تمام اسلامی ممالک اس کی مدد کو پہنچیں گے" پھر انیس اخبار نے اس سلسلہ میں حکومت پاکستان پر جو الزامات لگائے تھے ان سب کو سوا کالم میں نقل کیا ہے۔ الزامات سراسر غلط تھے انیس نے انہیں کس لئے شائع کیا اور آل انڈیا ریڈیو نے انہیں کیوں نشر کیا۔ اس کا اندازہ مدیر تسنیم کو ہوگا۔ انیس کے پاکستان کی سالمیت وبقا کی نسبت جو منصوبے ہیں۔ ان سے بھی مدیر تسنیم بے خبر نہ ہوں گے۔ لیکن حکومت پاکستان کی مخالفت وتذلیل کا نشہ ہے کہ ایک پاکستانی اخبار ان الزامات کی اشاعت کرتا ہے اور کابلی حکومت اور آل انڈیا ریڈیو کے کام میں آسانیاں پیدا کرتا ہے!

مولانا مودودی خود حکومت پاکستان اور لیگی لیڈروں کا ذکر کرتے ہوئے جس طرح کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اس کے لئے ان کا رسالہ "انتخابی جدوجہد" ملاحظہ ہو جس میں وہ فرماتے ہیں:۔

"ایک مدت دراز سے ہماری قومی سیاست پر وہ لوگ چھا رہے ہیں جو خدا سے بیخوف اور اخلاق کی بندشوں سے آزاد ہیں، ان لوگوں نے ہمارے اجتماعی ماحول کو بیت الخلا کے ماحول سے بھی زیادہ گندا کر دیا ہے۔"[1]

عدل وانصاف کے متعلق قرآنی ارشادات جماعت اسلامی کا دعویٰ ہے کہ وہ سوائے کلام مجید اور سنت نبوی کے کسی چیز کے قائل نہیں۔ اور عقل سمجھ اور قومی مصلحتیں ان کے لئے سنگ راہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اب ناظرین ہی انصاف کریں کہ حکومت پاکستان اور مسلم لیگ کی نسبت انہوں نے جو طرز عمل اختیار کر رکھا ہے اس میں کہاں تک ارشادات قرآنی اور اسوۂ نبوی کی پیروی ہوتی ہے۔ قرآن کریم کا واضح ارشاد ہے لا یجرمنکم شنان قوم ان لا تعدلوا۔ اعدلوا ھو اقرب للتقوی۔ یعنی کسی قوم کے خلاف شکایت تمہیں اس پر آمادہ نہ کر دے

---

[1] رسالہ انتخابی جدوجہد ص ۲۱

کہ تم انصاف نہ کرو۔ تم عدل کا شیوہ اختیار کرو کہ یہی پرہیز گاری سے زیادہ قریب ہے۔

قرآن حکیم تو شراب و قمار جیسی لعنتوں کا ذکر کرتے ہوئے بھی انصاف و عدل کا دامن ہاتھ سے نہیں دیتا اور اس امر کا اعتراف کرتا ہے کہ ان دونوں میں کچھ فائدے بھی ہیں۔ اگرچہ ان دونوں کا گناہ ان کے منافع سے زیادہ بڑا ہے۔ (اِثْمُهُمَا اَكْبَرُ مِن نَفْعِهِمَا)

کاش مولانا مودودی اور ان کے رفقائے کار غور فرمائیں کہ حکومت پاکستان کی نسبت جو طریق کار انہوں نے اختیار کر رکھا ہے وہ قرآنی ارشادات کے مطابق ہے؟

اگر وہ واقعات کو بہ نگاہ عدل و انصاف دیکھتے تو انہیں گذشتہ پانچ سال کے دوران میں حکومت پاکستان اور اکابر ملک کے اعمال میں ایک سو نہیں پچاس۔ پچاس نہیں پانچ ہی خوبیاں نظر آجاتیں اور ان کا ذکر ترجمان القرآن یا کوثر کے صفحات میں ہوتا!

اگر وہ قرآنی عدل کو کام میں لاتے۔ تو وہ دیکھتے کہ جس پاکستان کو "فاقستان" اور "لنگڑا پاکستان" کہا گئے تھے۔ جس کی نسبت برادران وطن کی رائے تھی کہ وہ چند مہینوں سے زیادہ چل نہیں سکتا اور جس کے عمال حکومت کی نسبت غیر جانبدار مبصرین بھی کہتے تھے کہ ان میں قابل تجربہ کار افراد کی کمی ہے آخر اسے چلانا۔ اور اس طریقے سے کہ وہ تھوڑے عرصے میں ایشیا کی دو چار مستحکم ترین مملکتوں میں شمار ہو جائے کسی کلمۂ خیر کا مستحق تھا!

اسلامی جماعت نے حکومت پاکستان کی نسبت جو روش اختیار کی ہے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے۔ کہ وہ عمال حکومت سے رسوائے ان انتہا پسندوں کے جو انہیں متواتر مشورہ مشکل سے ہی دے سکتے ہیں علیحدہ ہو گئے ہیں۔ لیکن پھر بھی وہ ان جفاکش محبان وطن سے بالکل نا آشنا نہیں۔ جنہوں نے اپنا خون پسینہ بہا کر "لنگڑا پاکستان" اس قابل بنا دیا۔ کہ وہ تنازع للبقا کی دوڑ میں اچھے اچھے ممالک کو پیچھے چھوڑ جائے۔ بالخصوص مولینا مودودی حکومت پاکستان کے سابق سیکرٹری جنرل اور موجودہ وزیر خزانہ چوہدری محمد علی کی قابلیت، جوش اسلامی، درویش طبعی اور عدیم النظیر محنت سے یقیناً واقف ہیں۔ جس رفتار پر وہ کام کرتے رہے ہیں۔ اس

کے لئے "تدریجی خودکشی" (SLOW SUICIDE) کے سوا کوئی لفظ نہیں۔ جب ان کے رفقا میں سے کوئی ان کی صحت کی طرف توجہ دلاتا۔ تو وہ ہنس کر ٹال دیتے۔ قریبی دوستوں میں سے کوئی زیادہ اصرار کرتا تو وہ صاف کہہ دیتے "SOME OF US HAVE TO FALL BY THE ROADSIDE SO THAT THE OTHERS MAY GET A CHANCE" (ہم میں سے بعضوں کو اپنے آپ کو پاکستان کے لئے قربان کر دینا ہوگا تاکہ دوسروں کو زندہ رہنے کا موقع مل جائے) بقول اخبار ڈان[1] کے چودھری صاحب نے اپنی طرف سے اپنے آپ کو ختم کر دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اور جس طرح (خدائے عزوجل کے انتہائی رحم و کرم کی بدولت) مہینوں کی کوشش کے بعد انہیں دھاکہ میں قبر کے دھانہ سے نکالا گیا ہے اس سے قوم واقف ہے۔

بلاشبہ چودھری محمد علی اپنی مثال آپ ہیں (اور ان کی مثال دوسرے ممالک میں کہاں ملتی ہے؟) عدیم النظیر قابلیت ایک خداداد چیز ہے لیکن جس جذبے سے وہ کام کرتے ہیں۔ اس کی تھوڑی بہت جھلک ان کے بعض دوسرے رفقائے کار میں بھی نظر آتی ہے اور فی الحقیقت یہی چیز تھی۔ جس کی بدولت پاکستان کی گاڑی چلتی رہی۔ ان خاموش کارکنوں کے نام دنیا کو معلوم نہیں۔ لیکن یہ خبر تو مصدقہ ہے کہ جب باہر سے آئے ہوئے ایک میڈیکل مشن نے حکومت پاکستان کے ملازموں کا طبی معائنہ کیا تو معلوم ہوا کہ ان میں سے ایک چوتھائی کو تپ دق کا عارضہ یقینی طور پر لاحق ہے۔ اور باقی میں سے ایک تہائی کی حالت شبہ سے خالی نہیں۔

ان اعداد و شمار سے ان زہرہ گداز حالات کا کچھ اندازہ ہوتا ہے جس کے ماتحت پاکستان کی حکومت چلانے والوں کو شروع میں کام کرنا پڑا ہے دوسرے ذریعوں سے بھی اس فرض شناسی اور حب الوطنی کا تھوڑا بہت پتہ چلتا ہے۔ جس سے متاثر ہو کر عمال حکومت کی ایک کافی تعداد نے کام کیا ہے مثلاً بریگیڈیر تیمر علی، جس نے جنگ شاہی کے ہوائی حادثہ کے وقت قیمتی کاغذات اور نقشے جہاز سے باہر پھینک دیئے تاکہ وہ تباہی سے محفوظ ہو جائیں۔ یا دہ ٹکٹ کلکٹر جس نے شیخ کرامت علی وزیر تعلیم حکومت پنجاب کو ہلنے نہ دیا جب

---

[1] اخبار ڈان مورخہ ۲۹ جون ۱۹۵۲ء (لیڈنگ آرٹیکل)

تک ان سے کرایہ اور بے ٹکٹ سفر کرنے کا) پورا جرمانہ وصول نہ کر لیا۔

بلاشبہ ان حضرات نے فقط اپنا فرض ادا کیا۔ وہ کسی تعریف کے طالب نہیں لیکن اسلامی عدل کا تقاضہ تھا۔ کہ جہاں صبح شام اسلامی جماعت کے اخبارات میں عمّال حکومت کی برائیاں بیان ہوتی ہیں وہاں کبھی کبھار کسی ایسے فرد کا بھی ذکر ہو جاتا جس میں ایک آدھ خوبی ہو!

اسلامی جماعت نے پاکستانی حکومت کے خلاف مسلسل پروپگنڈا کرنے کا جو وطیرہ اختیار کر رکھا ہے وہ عدل و انصاف کے قرآنی اصولوں کیخلاف ہے۔ اس کے علاوہ اس سے ایک دو بڑے مضر عملی نتائج بھی پیدا ہوئے ہیں۔ ایک نتیجہ تو یہ ہے کہ اس سے حکومت اور جماعت کیلئے مل کر کام کرنا ناممکن ہو گیا لیکن اس سے بھی زیادہ مضر نتیجہ یہ ہوا کہ عوام میں حکومت کیخلاف بددلی پیدا ہونی شروع ہوئی اور ایک ایسی فضا پیدا ہو گئی۔ جس نے پاکستان اور پاکستانیوں کو ملک اور عالم اسلامی کیلئے ان متحدہ اور پرجوش کوششوں سے باز رکھا جو ایک ملک کی ترقی و بقا کے لئے ضروری ہیں۔ اس سلسلے میں مولینا عبدالماجد دریابادی کے اخبار صدق میں ہندوستان کے ایک ماہنامہ کے اداریہ سے ذیل کی عبارت نقل ہوئی تھی:۔

"سخت ضرورت تھی۔ کہ اس وقت پاکستان اندرونی اختلافات سے دوچار نہ ہوتا اور وہاں کوئی ایسی پارٹی پیدا نہ ہوتی۔ جو موجودہ حکومت کی توجہ کو سیاست خارجہ کی طرف سے ہٹا کر اندرونی سیاست کی طرف لے آئے۔ لیکن افسوس ہے کہ تشکیل دستور کے سلسلہ میں اسلامی حکومت کے نظریہ کو پیش کر کے وہی فتنہ اٹھایا جا رہا ہے جو بدو اسلام میں خوارج نے اٹھایا تھا۔ اور اس کا لازمی نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں۔ کہ پاکستان میں تشتت و انتشار پیدا ہو جائے اور وہ اپنی بین الاقوامی ساکھ ہمیشہ کے لئے کھو بیٹھے"[1]

واقعہ یہ ہے کہ پاکستان بننے سے پہلے ہی مولانا مودودی نے سوچ رکھا تھا۔ کہ پاکستان میں لیگی لیڈر اور ہندوستان میں کانگریسی راہنما وہ سب امیدیں اور آرزوئیں پوری نہ کر سکیں گے جو عوام نے ہندوستان کی

---

[1]

آزادی اور قیام پاکستان سے باندھ رکھی ہیں۔ اور اس وقت جماعت اسلامی کو اس صورت حالات سے فائدہ اٹھا کر عوام کی زمام قیادت اپنے ہاتھ میں لینی چاہیئے۔ مولانا مودودی کے سارے منصوبے تو پورے نہیں ہوئے۔ تحریک پاکستان کے دوران میں جماعت نے جو طریق کار اختیار کیا اس کی وجہ سے عام طور پر مسلمان اس جماعت سے بدظن تھے۔ قیام پاکستان کے بعد بھی اس جماعت سے (مثلاً جہاد کشمیر کے متعلق) ایسی فاش غلطیاں ہوئیں کہ جماعت کو جمہور کا اعتماد حاصل نہ ہوا لیکن اسلامی جماعت کے مسلسل پراپاگنڈا کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ پاکستانی حکومت سے بعضوں کے دل کھٹے ہو گئے اور ملک میں ایک ذہنی انتشار پیدا ہو گیا

قوم اور ان اسلامی ممالک کے حق میں جن کے لئے پاکستان ایک امیدگاہ کی حیثیت رکھتا ہے اس صورت حالات سے جو نقصانات ہوئے ان کی تشریح غیر ضروری ہے لیکن شاید مولینا مودودی اور مولینا نصر اللہ خاں عزیز سے اس کی شکایت بے جا ہے۔ وہ پاکستان بننے ہی کے کب خواہاں تھے جو انہیں پاکستان کے ضعیف و غیر مؤثر ہونے کا کوئی رنج ہو!

قرار دادِ مقاصد

اسلامی نظامِ حکومت اور مسلم لیگ جب مسلم لیگ پاکستان کی لڑائی لڑ رہی تھی تو جماعتِ اسلامی نے اس کی مخالفت کی۔ مولانا مودودی نے ارکان جماعت کو ہدایت کی کہ وہ اس الیکشن میں ووٹ دینے سے، جس پر پاکستان کے بننے یا نہ بننے کا انحصار تھا باز رہیں اور تحریر و تقریر میں جا بجا مسلم لیگ اور تحریکِ پاکستان پر کثرت سے نکتہ چینی کی۔ ان کی کتاب "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم میں ایک مستقل عنوان تھا" پاکستانی خیال کے لوگ"۔ اس میں انہوں نے نہ صرف دلیل و برہان بلکہ تمسخر و استہزا سے پاکستانیوں کے مفاد کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی اور ان کی قیادت پر طرح طرح کے اعتراض کئے۔ جن میں بڑا اعتراض یہ تھا کہ اس تحریک کے قائدین پاکستان کو اسلامی مملکت بنانے کا وعدہ نہیں کرتے۔ مولانا فرماتے ہیں :-

"اس موقع پر یہ بات قابلِ ذکر ہے۔ کہ مسلم لیگ کے کسی ریزولیوشن اور لیگ کے ذمہ دار لیڈروں میں سے کسی کی تقریر میں آج تک یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمعِ نظر پاکستان میں اسلامی نظام حکومت قائم کرنا ہے۔ برعکس اس کے ان کی طرف سے بصراحت اور بتکرار جس چیز کا اظہار کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ان کے پیشِ نظر ایک ایسی جمہوری حکومت ہے جس میں دوسری غیر مسلم قومیں بھی حصہ دار ہوں۔ مگر اکثریت کے حق کی بنا پر مسلمانوں کا حصہ غالب ہو۔ بالفاظِ دیگر ان کو مطمئن کرنے کے لئے صرف اتنی بات کافی ہے۔ کہ ہندو اکثریت کے تسلط سے وہ صوبے آزاد ہو جائیں۔ جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ باقی رہا نظام حکومت تو وہ "پاکستان" میں بھی ویسا ہی ہوگا۔ جیسا ہندوستان میں ہوگا۔ ان کے نصب العین پر جب یہ اعتراض کیا گیا کہ مسلمانوں کی کافرانہ حکومت اسلامی نقطۂ نظر سے غیر مسلموں کی کافرانہ حکومت کے

مقابلہ میں کچھ بھی قابلِ ترجیح نہیں ہے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ قابلِ لعنت ہے تو ذمہ دار لیڈروں میں سے کسی نے اس کا جواب نہ دیا۔ البتہ جو لوگ پاکستانی حلقوں کی صف آخر میں شمار ہوتے ہیں اور جن کی کوئی ذمہ دارانہ حیثیت نہیں ہے۔ انھوں نے کہنا شروع کیا کہ مسلم اکثریت کو جب خود اختیاری حاصل ہو جائے گی تب ہم نظامِ حکومت بدلنے کی کوشش کریں گے۔"

جب خدا کے فضل سے اس مخالفانہ پراپاگنڈا کے باوجود پاکستان قائم ہو گیا تو اسلامی نظامِ حکومت کے اجراء سے انکار اسلامی نظامِ حکومت کے قیام کے حتمی اور بار بار دہرائے ہوئے وعدے" بن گئے۔ اور اب جماعتِ اسلامی کی طرف سے یہ مسلسل پراپاگنڈا ہونے لگا۔ کہ مسلم لیگ کے ذمہ دار لیڈروں نے قیامِ پاکستان سے پہلے وعدہ کیا تھا۔ کہ وہ اسلامی نظامِ حکومت قائم کریں گے۔ بلکہ پاکستان حاصل کرنے کا مقصد ہی اسلامی نظامِ حکومت[2] کا قیام تھا۔ جب تک حکومت اس کا انتظام نہیں کرتی نہ اس کے ملازمین پر اس کی

---

[1] مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم ص ۱۳۰ - ۱۳۱

[2] مولانا مودودی کے اپنے الفاظ ملاحظہ ہوں "میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ قیامِ پاکستان کی جدوجہد کے سلسلے میں آپ کو جو کچھ سمجھایا گیا تھا۔ وہ یہ تھا کہ پاکستان کے قیام سے مقصود ایک ایسی حکومت قائم کرنا ہے جس کا نظام خدا کی کتاب پاک اور اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر مبنی ہو۔ اور تمام مسلمان اسلامی اصولوں کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ لیڈروں کے ذہن میں اس وقت چاہے جو کچھ بھی ہو کم از کم زبانوں سے انھوں نے ہر اسٹیج اور ہر منبر پر کھڑے ہو کر یہی کہا تھا۔ اور عام مسلمانوں نے ان کے انہی وعدوں اور ان کے ظاہر کردہ انہی ارادوں پر یقین کر کے پاکستان کی تحریک میں ان کا ساتھ دیا" ملاحظہ ہو دستوری سفارشات پر تنقید از سید ابوالاعلیٰ مودودی (شائع کردہ شعبہ نشر و اشاعت جماعتِ اسلامی کراچی) ص ۷)

شاید مولانا مودودی کے اس ارشاد کا سیاسی کشمکش والے اندراج سے مقابلہ کر کے بعض "ظاہرین" یہ

وفاداری فرض ہے نہ اس کی فوج کی ملازمت جائز ۔

اس نقطۂ نظر کی وجہ سے جماعت اور حکومت کے درمیان خلیج پیدا ہونی تھی سو ہو گئی ۔ چنانچہ ۴ اکتوبر ۱۹۴۸ء کو مولانا مودودی مع دو ساتھیوں کے نظربند ہوئے ۔ جماعت کے اخبارات کوثر اور تسنیم پر بھی پابندی لگی ۔ اور اسلامی جماعت سیاسی جماعت قرار پائی ۔ تاکہ سرکاری ملازم اس کے ارکان نہ بن سکیں ۔

حکومت نے اسلامی جماعت کے خلاف جو قدم اٹھائے ۔ عام طور پر انہیں پسند کیا گیا ۔ سرکاری ملازموں اور فوج کے متعلق جماعت کی جو ہدایات تھیں انہیں مسلمان بالعموم مفاد ملی کے خلاف سمجھتے تھے اور مسئلہ کشمیر پر مولانا مودودی کے بیانات سے تو عوام میں سخت برگشتگی پیدا ہوئی چنانچہ حکومت نے مولانا اور ان کی جماعت کے خلاف کارروائی کی تو اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا ۔

قرارداد مقاصد کے متعلق اقدامات مولانا مودودی کی گرفتاری کے بعد ان کے رفقائے کار کی رسمی کارروائیاں جاری رہیں ۔ اس وقت جماعت کا بازار سرد ہو چکا تھا ۔ اگر جماعت کے خلاف مختلف اقدامات سے حکومت کا مقصد اسلامی نظام حکومت کی مخالفت ہوتا ۔ تو اس نظام کے لئے اس زمانہ میں قدم اٹھانے کی کوئی ضرورت نہ تھی ۔ لیکن فی الحقیقت مولانا مودودی اور ان کے رفقائے کار کے خلاف ان اقدامات کا پاکستان کے آئینی مستقبل سے کوئی تعلق نہ تھا ۔ اس لئے عین اس زمانے میں جب جماعت اسلامی ایک جسد بے جان تھی ۔ مسلم لیگ نے اپنے عزائم اور مقاصد و مواعید کے مطابق اسلامی اصولوں پر آئین سازی کا آغاز کیا ۔

مولانا مودودی کی نظربندی کے دو ڈھائی مہینے بعد مجلس آئین ساز کے سرکردہ لیگی ممبران نے جن

(بقیہ فٹ نوٹ) کہیں کہ یا مولانا کا پہلا بیان سچا ہے یا دوسرا اور مولانا کے حافظہ کی شکایت کریں لیکن مولانا کی ذہانت اور قابلیت سے بعید نہیں کہ وہ ان متضاد بلکہ صریحی مخالفت بیانات کی بھی تاویل کر سکیں ۔

میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں قرار دادِ مقاصد کا ڈھانچہ مرتب کیا مولانا مودودی کی نظر بندی کے متعلق جماعت اسلامی کے شعبۂ نشر و اشاعت کی طرف سے جو رسالہ شائع ہوا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ "جماعتِ اسلامی کے اہم ترین کارکنوں کو نظر بند کر کے حکومت اپنی جگہ مطمئن ہو گئی تھی کہ اب مطالبۂ نظامِ اسلامی کا زور ہم نے توڑ دیا ہے۔ اور جماعتِ اسلامی کی تحریک کے پھیلنے کی ہوا ہم نے نکال دی۔ یہاں تک کہ گرفتاری کے دو ماہ بعد دسمبر ۱۹۴۸ء میں در پردہ یہ اسکیم بن چکی تھی۔ کہ پاکستان کے ایک لادینی (SECULAR) ریاست ہونے کا اعلان کر دیا جائے" جماعت کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ اس کے بعد کارکنانِ جماعت نے حکومت کو اپنا موقف تبدیل کرنے پر مجبور کیا اور حکومت نے گھٹنے ٹیک دیئے" ذمہ داری اور دیانت داری کا تقاضا تھا کہ حکومت پر یہ سنگین الزامات لگاتے وقت اس رسالہ کے مصنف ان شواہد کو بھی واضح کر دیتے جن کی بنا پر یہ الزامات لگائے۔ ہم نے اس بارے میں ذمہ دار حضرات سے جو استفسار کئے۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ موجودہ قرار دادِ مقاصد کا ڈھانچہ (جو بالکل انہی اصولوں پر تھا۔ جن پر قرار داد کی آخری صورت مجلسِ آئین ساز میں پیش ہوئی) دسمبر ۱۹۴۸ء کے آخر ہی میں مرتب ہو چکا تھا۔ اور مسلم لیگ کی پارٹی سے اس کے منظور کرانے میں سب سے زیادہ دخل مولانا شبیر احمد عثمانی اور ان کے بعد وزیر اعظم نواب زادہ لیاقت علی خاں، وزیر امورِ داخلہ خواجہ شہاب الدین۔ آنریبل چودھری نذیر احمد خاں اور ڈاکٹر عمر حیات خاں کو تھا۔

ہم نے اپنی بساط کے مطابق قرار دادِ مقاصد کی تاریخ کی پوری تحقیق کر لی ہے۔ لیکن چونکہ زبانی بیانات میں اختلافات اور شک و شبہ کی گنجائش رہتی ہے۔ اس لئے وہ تفصیلات یہاں درج نہیں کرتے۔ البتہ پبلک اعلانات اور تحریری شہادتوں کی بنا پر بالوثوق یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک آدھ ذمہ دار لیگی لیڈر کو چھوڑ کر باقی سب شروع ہی سے قرار دادِ مقاصد کو انہی اصولوں پر مرتب کرنا چاہتے تھے جن پر وہ فی الواقع مرتب ہوئی۔

جمہوریت میں افراد کو بڑی آزادی ہوتی ہے۔ اور جب تک کوئی کانسٹیٹیوشن یا قرار داد منظور نہ ہو جائے یا پارٹی اس کے حق میں فیصلہ نہ دے دے۔ جماعت کے ارکان بھی اپنے اپنے خیال کے مطابق اظہار رائے کرتے رہتے ہیں۔ لیکن قیام پاکستان کے بعد قائدِ اعظمؒ اور لیاقت علی خاں مرحوم نے ہمیشہ اُن اصولوں پر زور دیا۔ جن پر قرار داد مقاصد کی بنیادیں رکھی گئیں۔ قائدِ اعظمؒ نے اسٹیٹ بنک کے افتتاح کے موقع پر یعنی اپنی آخری تقریر میں انہی اسلامی اصولوں پر زور دیا۔ انہی خیالات کا اظہار ذمہ دار لیگی اخبارات نے کیا ۱۹۴۸ء کے وسط میں اسلامی جماعت پر سب سے کڑے اعتراضات جس اخبار نے کیے وہ "نوائے وقت" تھا۔ جو اس زمانہ میں پنجاب کی لیگی حکومت کا ترجمان تھا۔ لیکن عین اس وقت جب مولانا مودودی حکومت پنجاب کے حکم سے نظر بند ہوتے ہیں۔ یہ اخبار اسلامی نظام کی حمایت کرتا ہے۔

مولانا مودودی ۴ر اکتوبر ۱۹۴۸ء کو نظر بند ہوئے۔ اور اس کے ٹھیک ایک ہفتہ بعد یعنی ۱۱ر اکتوبر کو "نوائے وقت" نے ایک ایڈیٹوریل میں لکھا:۔

"یہاں تک خاص پاکستان اور اس ملک میں نظام اسلامی کی ترویج و قیام کے مسئلہ کا تعلق ہے یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ حکومت ایسا مطالبہ کرنے والوں کو غدار سمجھتی ہے۔ یا ان سے بدکتی ہے۔ خود اس مملکت کے بانی اور سب سے واجب الاحترام لیڈر محمد علی جناح مرحوم و مغفور بارہا یہ اعلان فرما چکے ہیں کہ پاکستان کی بنیاد ہی مسلمانوں کی اس خواہش پر رکھی گئی تھی کہ وہ اس ملک میں اسلامی تعلیمات کے مطابق زندگی بسر کرسکیں۔ اس لئے اس ملک کے دستور کی اساس لازمی طور پر قرآنی و اسلامی اصولوں پر رکھی جائے گی وزیرِ اعظم پاکستان بھی کئی مرتبہ اس خیال کا اظہار کر چکے ہیں۔ اور ہمیں یقین واثق ہے۔ کہ قائدِ اعظمؒ کی وفات کے بعد آپ کے نائبین اور جانشین مرحوم کے مذکورہ بالا اعلان کو عملی جامہ پہنانا اپنا فرض خصوصی سمجھیں گے۔"

جماعتِ اسلامی کے شعبہ نشر و اشاعت کا بیان ہے کہ مولانا مودودی کی نظر بندی کا مقصد مطالبہ نظامِ اسلامی کو ختم کرنا تھا۔ اگر مقصد فی الواقع یہ تھا۔ تو اس سے زیادہ احمقانہ طریقِ کار کوئی نہیں ہو سکتا کہ جو صوبجاتی حکومت مولانا کو نظر بند کرتی ہے۔ اِس کے ترجمان اخبار میں پورے زور سے نظام اسلامی کی حمایت کی جائے !

قرار داد مقاصد کا ڈھانچہ ان جلسوں میں مرتب ہوا۔ جو وزیر داخلہ خواجہ شہاب الدین صاحب کے مکان پر منعقد ہوئے۔ پھر یہ ایک پارٹی میٹنگ میں پیش ہوا۔ اس پر مزید غور و خوض کے لئے ایک سب کمیٹی بنی اور بالآخر اس کمیٹی کی رپورٹ اور مسلم لیگ پارٹی کے ارکان کی منظوری کے بعد مارچ ۱۹۴۹ء میں وزیرِاعظم پاکستان نے مجلسِ آئین ساز میں قرار داد کو پیش کیا جو وہاں چند روز کی بحث و تمحیص کے بعد منظور ہوئی۔

قرار داد مقاصد اسلامی جماعت کی کوششوں کا نتیجہ نہیں

اِسلامی جماعت کا دعویٰ ہے کہ قرار دار مقاصد کی منظوری ہماری کوششوں کی مرہونِ منت ہے۔ تاریخی حیثیت سے اس دعوے میں حقیقت کا جو عنصر ہے اس کا ہم ذکر کر چکے۔ لیکن لطف یہ ہے کہ قرار داد مقاصد سرے سے اس قسم کی دستاویز ہی نہیں جس کا مطالبہ اسلامی جماعت شروع سے کر رہی تھی۔ اِسلامی جماعت کو سب سے زیادہ ضد جمہور کے حق قانون سازی سے ہے۔ لیکن قرار دادِ مقاصد کے تحت قانون سازی کا حق انہی کو دیا گیا ہے۔ یہ سچ ہے۔ کہ یہ حق چند حدود کے اندر عمل پذیر ہوگا۔ لیکن پھر بھی جمہور کے لئے ایک وسیع دائرہ اثر باقی رہتا ہے۔ اور ان حدود کے تعین کے متعلق جو اختلافات ہوں گے ان کے فیصلے کا حق بھی جماعتِ اسلامی کی خواہش کے مطابق علما کو نہیں، بلکہ جمہور کے نمائندوں کو ہوگا اس کے علاوہ وزیرِاعظم پاکستان اور دوسرے سرکردہ لیڈروں نے قرارداد مقاصد کے متعلق بحث کے دوران میں واضح کر دیا کہ ان کا نقطہ نظر وہ نہیں جو اسلامی جماعت کا ہے۔ مثلاً جب غیر مسلموں

کے حقوق کے متعلق ایک غیر مسلم رکن اسمبلی نے (مولانا مودودی کے) رسالہ "اسلام کا نظریہ سیاسی" کا ایک حوالہ پڑھ کر سُنایا اور غیر مسلموں کے خدشات بیان کئے تو وزیر مواصلات (سردار عبدالرب نشتر) نے اِس کا اطمینان کراتے ہوئے رسالہ کے مصنف کے متعلق کہا کہ :-

"جانتے ہو وہ شخص کہاں ہے .... وہ جیل میں ہے[1]"

وزیر اعظم نے خود اپنی اختتامی تقریر میں بالوضاحت (اسلامی جماعت) "لاہور کے اِن علما کو متنبہ کیا[2]" جن کی غلط ترجمانیوں سے غیر مسلموں کے دلوں میں خدشات پیدا ہو رہے تھے۔ نائب وزیر امور داخلہ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب نے بھی اپنی تقریر میں یہ بات صاف کر دی کہ قرارداد مقاصد سے کسی قسم کی مذہبی حکومت (THEOCRACY) قائم نہیں ہوگی۔ انہوں نے ۱۲ فروری کو ایک تقریر میں بالتفصیل اس سوال سے بحث کی کہ آیا پاکستان کی حکومت "سیکولر[3]" ہوگی یا ایک "تھیوکریسی"

---

[1] "مولانا مودودی کی نظر بندی کیوں" - (شائع کردہ شعبہ نشر و اشاعت جماعت اسلامی) صفحہ ۱۹

[2] جنگ ۱۴ / مارچ ۱۹۴۹ء وغیرہ

[3] "سیکولر" کا ترجمہ اسلامی جماعت کے لٹریچر میں "لادینی" کیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ غلط ہے - علم سیاسیات میں یہ لفظ (THEOCRACY) سے تضاد ظاہر کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ تھیوکریسی سے مراد وہ طرز حکومت ہے۔ جس میں عنان اقتدار پروہتوں یا مذہبی راہنماؤں کے ہاتھ میں ہو اور سیکولر سے مراد وہ طرز حکومت ہے۔ جس میں عنان حکومت پروہتوں کے ہاتھ میں نہ ہو (اور دُنیاداروں، مثلاً عوام کے نمائندوں کے ہاتھ میں ہو)

افسوس ہے کہ مولانا مودودی الفاظ کا مفہوم بتاتے وقت وہ احتیاط روا نہیں رکھتے جس کی ایک عالم دین سے توقع ہو سکتی ہے۔ سیکولر حکومت کے خلاف انہوں نے عوام میں جو جذبہ پیدا کر دیا ہے۔ اُس کی بنیاد اس لفظ

وہ فرماتے ہیں

"پاکستان کے مذہبی مملکت ہونے کی بابت اور مذہبی اور جمہوری مملکتوں کے درمیان جو فرق ہے اس کی بابت بھی بہت کچھ کہا جا چکا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ تھیوکریسی کے لفظی معنی خدا کی حکومت کے ہیں اس مفہوم میں ساری کائنات ایک مذہبی حکومت ہے، اگر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ خدا کہیں بھی حکومت نہیں کرتا تو انہیں اختیار ہے کہ یہ رائے رکھیں ۔۔۔۔۔۔ علم سیاست میں تھیوکریسی کا صرف ایک مفہوم ہے اور وہ یہ ہے کہ کاروبار حکومت کا ایسے پنڈتوں، پادریوں یا ملاؤں کے ہاتھ میں ہونا جو مذہبی طریق پر مقرر کئے گئے ہوں اور جو خود کو خدائی اختیارات حکمرانی کا حامل تصور کرتے ہوں اسلام میں ایسی مذہبی حکومت ناممکن ہے۔ کیونکہ اسلام میں ایسے اختیار یافتہ ملاؤں کا طبقہ ہوتا ہی نہیں۔ اس لئے اسلامی مملکت میں مذکورہ قسم کی مذہبی حکومت قائم نہیں ہو سکتی۔

(بقیہ فٹ نوٹ) کے غلط اور گمراہ کن ترجمہ پر ہے۔

اس رجحان کی کئی مثالیں اسلامی جماعت کے لٹریچر اور خود مولانا مودودی کی تصانیف میں ملیں گی۔ مثلاً مولانا کے رسالہ "اسلام کا نظریہ سیاسی" کا عربی میں مولانا مسعود عالم ندوی نے ترجمہ کیا ہے۔ اس کے متعلق عرب کے ایک قدامت پسند عالم کا جو حرمت تصویر کے حق میں ایک رسالہ لکھ چکے ہیں، تبصرہ ملاحظہ ہو۔ "شیخ عبدالعزیز نے "نظریہ سیاسی" کی تعریف کی۔ اور مولانا مودودی کا حال دریافت کیا۔ " انزلنا الحدید فیه باس شدید " میں حدید کے معنی مولانا مودودی نے "سیاسی قوت" کے لئے ہیں۔ اس پر انہوں نے اعتراض کیا۔ پھر بولے ممکن ہے اصل میں "اساسی قوت" ہو۔ ترجمے میں "سیاسی" ہو گیا ہو۔ عرض کیا اصل (یعنی مولانا مودودی کے رسالہ) ہی میں "سیاسی قوت" ہے مترجم نے اصل کی پابندی کی ہے۔ (دیار عرب میں ص ۲۰۷) اسی طرح جمعیۃ العلمائے پاکستان لاہور نے ایک رسالہ میں یہ رائے ظاہر کی کہ مولینا مودودی کا یہ

سیکولر حکومت کا مطلب صرف یہ ہے کہ کاروبار حکومت ایسے دنیا دار عوام کے ہاتھوں میں ہے جن پر مذکورہ قسم کے پادریوں پنڈتوں یا ملاؤں کا کوئی اختیار نہیں ہے .... لفظ "ملّائی حکومت" اور پاکستان، یا ملّائی حکومت اور اسلامی مملکت ایک ہی مفہوم میں استعمال نہیں کئے جا سکتے۔ ایک اسلامی مملکت میری وضاحت کے پیش نظر لازماً سیکولر ہوتی ہے۔...... لیکن میرے دوست .... اگر یہ چاہتے ہیں کہ پاکستان کا نظم ونسق اسلامی اصولوں کے مطابق نہ ہو تو میرے نزدیک وہ ایک ایسی چیز چاہتے ہیں جو ناممکن ہے"۔

اسلامی جماعت کا تو شروع سے انتہا پسندانہ نقطۂ نظر ہے۔ چونکہ قرارداد مقاصد میں مختلف زاویہ ہائے نگاہ کو تطبیق دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس لئے عام علما کی بھی پوری طرح تشفی نہیں ہوئی۔ خود مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے بھی قرارداد کی تائید کرتے وقت اس کو ایک "ڈھیلا ڈھالا ریزولیوشن" کہا تھا۔

"جس سے عام مسلمانوں اور غیر مسلموں کو گھبرانے اور وحشت کھانے کی کوئی وجہ نہیں"۔

(بقیہ فٹ نوٹ) نظریہ کہ ایک "امیدوار" کے حق میں رائے دینا اسلام کے خلاف ہے۔ کلام مجید کی آیت کے غلط مفہوم پر مبنی ہے۔ اسی طرح انتخابی جدوجہد میں ص ۷ میں "نجعلھا" کے معنی مولینا "رکھیں گے" لکھتے ہیں۔ ص ۸ میں لَا تَسْتَعْمِلُ کے معنی لکھتے ہیں "استعمال نہیں کرتے" کہیں کہیں جو اضافے متن ترجمہ میں ہوتے ہیں۔ وہ دخل بے جا سے کم نہیں۔ ملاحظہ ہو انتخابی جدوجہد صفحہ ۸ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا کے معنی بتائے ہیں جو زمین میں **خود** بڑائی نہیں چاہتے۔ اور نہ فساد کا ارادہ رکھتے ہیں۔

مولانا امین احسن اصلاحی سے بھی ایسی ہی غلطیاں سرزد ہوئی ہیں۔ ملاحظہ ہو پاکستانی عورت دوراہے پر ص ۱۰۲، اکتساب کے معنی 'کمائی کرنا' بتائے ہیں۔ اسی طرح اسی کتاب کے صفحہ ۱۳۷ پر کسی ضرورت سے "مں" کا خواہ مخواہ اضافہ کیا ہے۔ (صفحہ آئندہ)

واقعہ یہ ہے کہ قرارداد مقاصد مسلم لیگ کی قرارداد مقاصد ہے نہ کہ اسلامی جماعت یا جمعیتہ العلماء کی۔ یہ ایک اسلامی جمہوریت (ISLAMIC DEMOCRACY) کا سنگِ بنیاد ہے۔ مذہبی حکومت (تھیوکریسی) کا نہیں۔ اس میں اسلام اور مسلمانوں، دونوں کے تقاضے پورے کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور مسلمانوں کی دینی ہی نہیں بلکہ دینوی ضروریات کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے۔ اس میں اسلام کے اصولوں پر بھی زور ہے۔ اور ساتھ ساتھ جدید آئین سازی کی باتیں بھی آگئی ہیں بلکہ اقلیتوں کے متعلق تو ایسی باتیں بالصراحت موجود ہیں جو جدید آئین سازی کے مطابق ہیں۔ لیکن جنہیں بعض علماء ایک کامل شرعی اسلامی حکومت کے منافی خیال کریں گے۔ قرارداد میں "مفادِ قومی" کا پورا پورا لحاظ ہے۔ اور خود قرارداد مقاصد کے اصولوں کا مقصد اولیٰ حسب ذیل معین کیا گیا ہے۔

"تاکہ اہلِ پاکستان فلاح و خوش حالی کی زندگی بسر کر سکیں، اقوام عالم کی صف میں اپنا جائز اور ممتاز مقام حاصل کر سکیں۔ اور امنِ عالم کے قیام اور بنی نوع انسان کی ترقی و بہبودی میں کماحقہ اضافہ کر سکیں۔"

قراردادِ مقاصد پوری قراردادِ مقاصد حسبِ ذیل ہے:-

بسم اللہ الرحمن الرحیم

چونکہ اللہ تبارک و تعالیٰ ہی کل کائنات کا بلاشرکت حاکم مطلق ہے اور اس نے جمہور کی وساطت سے مملکت پاکستان کو اختیار حکمرانی اپنی مقرر کردہ حدود کے اندر استعمال کرنے کے لئے نیابتہً عطا فرمایا ہے۔ اور چونکہ یہ اختیار حکمرانی ایک مقدس امانت ہے۔ لہٰذا جمہور پاکستان کی نمائندہ، یہ مجلس دستور ساز فیصلہ کرتی ہے کہ آزاد خود مختار مملکت پاکستان کے لئے ایک دستور مرتب کیا جائے۔

بعض جگہ تو ان ترجموں میں اس آزادی سے کام لیا جاتا ہے کہ "تحریف" کی نوبت آجاتی ہے۔

جس کی رو سے مملکت جملہ حقوق و اختیارات حکمرانی جمہور کے منتخب کردہ نمائندوں کے ذریعہ سے اِستعمال کرے۔

جس میں اصولِ جمہوریت و حریت و مساوات و رواداری اور عدل عمرانی کو جس طرح اسلام نے ان کی تشریح کی ہے پورے طور پر ملحوظ رکھا جائے۔

جس کی رو سے مسلمانوں کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی زندگی اسلامی تعلیمات و مقتضیات کے مطابق، جو قرآن مجید اور سنت رسولؐ میں متعین ہیں، ترتیب دے سکیں۔

جس کی رو سے اس امر کا قرار واقعی انتظام کیا جائے کہ اقلیتیں آزادی کے ساتھ اپنے مذہب پر عقیدہ رکھ سکیں اور اس پر عمل کر سکیں اور اپنی ثقافتوں کو ترقی دے سکیں۔

جس کی رو سے وہ علاقے جو فی الحال پاکستان میں داخل ہیں یا شامل ہو گئے ہیں۔ اور ایسے دیگر علاقے جو آیندہ پاکستان میں داخل یا شامل ہو جائیں ایک وفاقیہ بنائیں جس کے ارکان مقررکردہ حدود و اربعہ و متعینہ اختیارات کے ماتحت خود مختار ہوں۔

جس کی رو سے بنیادی حقوق کی ضمانت کی جائے اور ان حقوق میں قانون و اخلاق عامہ کے ماتحت مساوات حیثیت و مواقع قانون کی نظر میں برابری، عمرانی، اقتصادی اور سیاسی عدل، خیال اظہار عقیدہ، دین، عبادت اور ارتباط کی آزادی شامل ہوں۔

جس کی رو سے اقلیتوں اور پس ماندہ و پست طبقوں کے جائز حقوق کے تحفظ کا قرار واقعی انتظام کیا جائے۔

جس کی رو سے نظام عدل کی آزادی کامل طور پر محفوظ ہو۔

جس کی رو سے وفاقیہ کے علاقوں کی صیانت، اس کی آزادی اور اس کے جملہ حقوق کا۔ جن میں اس کے بحر و بر اور فضا پر سیادت کے حقوق شامل ہیں۔ تحفظ کیا جائے۔

تاکہ اہلِ پاکستان فلاح وخوش حالی کی زندگی بسر کرسکیں۔ اقوامِ عالم کی صف میں اپنا جائز اور ممتاز مقام حاصل کرسکیں۔ اور امن عالم کے قیام اور بنی نوع انسان کی ترقی وبہبود میں کماحقہٗ اضافہ کرسکیں۔"

قرار دادِ مقاصد اور اسلامی جماعت اصولاً جماعت اسلامی کے لئے قرار داد مقاصد سے مطمئن ہونے کی کوئی تحقیقی وجہ نہ تھی۔ جماعت کے اہم ترین ارکان بدستور نظر بند تھے۔ قرار داد مقاصد پر بحث کرتے وقت وزیرِ اعظم اور دو وزرا نے اسلامی جماعت کے نقطہ نظر سے اپنے اختلافات کو نمایاں بھی کیا۔ اِس کے علاوہ مجلس آئین ساز کے حقوق پر جو کڑی شرطیں جماعت عائد کرنا چاہتی تھی وہ بھی اِس میں موجود نہ تھیں۔ اور تو اور اس قرار داد میں کہیں پاکستان کو اسلامی ریاست بھی نہیں کہا گیا۔ نہ ہی اس کے مطابق اسلام ریاست کا مذہب تسلیم ہوا۔ چنانچہ جب یہ قرار داد جماعت اِسلامی کی مجلس شوریٰ میں پیش ہوئی تو "لاہور کے ارکان کی اکثریت[1]" اس کے خلاف تھی لیکن مجلس کو صاف نظر آرہا تھا کہ عامۃ المسلمین قرار داد سے مطمئن تھے اور جس قسم کی قرار داد مقاصد اہلِ پاکستان کی زیادہ سے زیادہ اکثریت چاہتی تھی وہ پاس ہوچکی تھی اور جماعت میں اپنی مرضی کا اساس آئین منوانے کی سکت نہ تھی۔ اِس لیے مصلحت اسی میں سمجھی گئی کہ قرار داد کا خیر مقدم کیا جائے اور پاکستان کو اصولاً ایک اسلامی ریاست کا درجہ دیا جائے۔ تاکہ سرکاری ملازمتوں اور فوج کے متعلق جماعت کے نقطہء نظر سے جو پیچیدگیاں پیدا ہوگئی تھیں وہ دور ہوں اور حکومت کے ساتھ جس کشمکش کی تاب جماعت میں نہ تھی اس کا خاتمہ ہو۔

اِسلامی جماعت کے ارکان قرار داد مقاصد سے خوش نہ تھے۔ لیکن واقعات سے مجبور ہو کر جماعت

---

[1] ملاحظہ ہو اسلامی جماعت کراچی کا پرچہ جہان نو بابت یکم دسمبر ۱۹۴۹ء

نے اس کی نسبت کچھ اس قسم کی پالیسی اختیار کی۔ جو کانگریس نے کیبنٹ مشن کی تجاویز کے متعلق اختیار کی تھی۔ یعنی بظاہر تو قرار داد کو تسلیم کر لیا۔ مگر معنی اس کو وہ پہنانے لگے جو قرار داد کے مرتب کنندگان کے ذہن میں قطعاً نہ تھے۔ یا جن کی تردید وہ قرار داد پیش کرتے وقت خود کر چکے تھے۔ بلکہ اس سے ایسی چیزیں منسوب ہونے لگیں۔ جن کا سراغ بھی قرار داد مقاصد میں نہیں ملتا۔

قرار دادِ مقاصد کی غلط ترجمانی

قرار داد مقاصد بقول مولانا شبیر احمد عثمانی رح "ایک ڈھیلی ڈھالی" قرار داد ہے۔ اس میں مختلف زاویہ ہائے نگاہ کو تطبیق دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن جماعت اسلامی اس میں وہ اثرات پیدا کرنا چاہتی ہے۔ جو مجلس آئین ساز کے خواب و خیال میں بھی نہ تھے۔ مثلاً پاکستان کی خارجی پالیسی کا مسئلہ ہے۔ پاکستان کو یہ سوال کبھی نہ کبھی حل کرنا ہوگا کہ وہ کامن ویلتھ (دولت مشترکہ) کا رکن رہے یا نہ رہے تمام سمجھ دار ممالک ایسے سوالات کا فیصلہ، مناسب وقت پر، اپنے نفع اور نقصان کا موازنہ کر کے کرتے ہیں۔ لیکن اسلامی جماعت کا کہنا ہے کہ پاکستان نے قرار داد مقاصد منظور کر لی ہے۔ اس لئے اس کے ساتھ ہی یہ بھی طے ہو گیا۔ کہ پاکستان دولت مشترکہ کا رکن رہے گا یا نہیں۔

کوثر نے یکم جون ۱۹۴۹ء کے پرچے میں قرار داد مقاصد کے نتائج کا تفصیلی تجزیہ کیا ہے پاکستان اور دولت مشترکہ کے تعلق کے ذکر کے بارے میں اس اخبار نے لکھا ہے۔

"ہمارے وزیر اعظم حال ہی میں لندن کانفرنس میں شریک ہو کر کراچی لوٹے ہیں۔ انہوں نے بعض بیانات میں اس خیال کا اظہار کیا ہے۔ کہ تعلق کا تعین کرنا دستور ساز اسمبلی کے اختیار میں ہے اور وہی اس کا فیصلہ کرے گی۔ ہمارے نزدیک یہ فکر و نظر کی بہت بڑی خیرگی ہے قرار داد مقاصد میں جب اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کو تسلیم کر لیا گیا تو برطانیہ کے بادشاہ کی وفاداری خواہ وہ محض رسمی ہی ہو۔ کس طرح باقی رہ سکتی ہے۔ اور یہ کہنا قرار داد مقاصد کے ساتھ انتہائی ظلم کرنا ہے کہ برطانیہ کے ساتھ

پاکستان کے تعلق کا فیصلہ کرنا اسمبلی کا کام ہے۔ اسمبلی کا اب کوئی کام باقی نہیں رہا۔ اور اگر باقی ہے تو صاف ظاہر ہے کہ اس نے قرار داد مقاصد کو منظور کرنے میں دیانتداری سے کام نہیں کیا مسلمانوں کو فریب دینے کی مذموم کوشش کی ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ ہمارے سیاستدانوں کے متعلق قوم اس قسم کی گھٹیا رائے قائم کرنے پر مجبور ہو۔"

اِسی طرح پاکستان کے معاشی اور اقتصادی نظام کا مسئلہ ہے۔ جس پر قوم کی بہبودی اور اہلِ پاکستان کی خوش حالی منحصر ہے اس کی نسبت کوثر لکھتا ہے:۔

" دوسرا مسئلہ پاکستان کے معاشی اور اقتصادی نظام کا ہے۔ اِس معاملے میں یہ بات بالکل صاف ہے کہ ہمیں کمیونزم اور سرمایہ دارانہ نظام کے حسن و قبح سے بحث کرنے کا کوئی حق نہیں رہا۔ سوال یہ نہیں کہ جاگیرداری۔ زمینداری اور اجارہ داری مفید ہے یا مُضر۔ بلکہ صرف یہ سوال ہے کہ اسلام کا بنیادی نقطۂ نظر اس معاملہ میں کیا ہے۔"

یہ خدا ہی جانتا ہے کہ کوثر کو اس بات سے کیوں ضد ہے۔ کہ مسلمان کسی چیز کے "مفید یا مضر" ہونے اور اس کے "حسن و قبح" پر غور کریں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ان باتوں پر سوچتے وقت اسلام کے نقطۂ نظر کو پوری اہمیت نہ دی جائے۔ لیکن معلوم نہیں اِسلامی جماعت کو اس امر پر اتنا اصرار کیوں ہے۔ کہ جمہور ہی ان باتوں کا فیصلہ کرتے وقت جن پر ملک اور قوم کی بہبود منحصر ہے۔ ان کے فائدے اور نقصان کو بالکل نظر انداز کر دیں اور لُطف یہ ہے کہ جس چیز یعنی " اسلام کے بُنیادی نقطۂ نگاہ" کا نام لے کر قوم سے اپنے نفع نقصان سوچنے کا حق سلب کیا جاتا ہے۔ وہ بھی کوئی اس قدر قطعی چیز نہیں معلوم ہوتی یا کم از کم کوثر اس بارے میں عام علمائے دین اور" رائج الوقت اور اصطلاحات کے اِعتبار سے" اسلام جو کچھ سکھاتا ہے اس پر بھی اعتماد کرنے کے لئے تیار نہیں! کوثر کی اسی اشاعت میں لکھا ہے:۔

"ہماری حکومت کا فرض ہے۔ کہ وہ اسلام کی تعلیمات پر گہری نظر رکھنے والے دیانتدار اور حوصلہ مند علماء سے حقیقت حال دریافت کرے۔ سرکاری مولوی یا امراء کے خوانِ کرم کے خوشہ چیں علما یا زمانے کی ہوا کے رُخ پر اپنا منہ پھیر لینے والے عالمان دین ہمارے کسی مطلب کے نہیں۔ ہمیں اس سے بحث نہیں کہ رائج الوقت اور اصطلاحات کے اعتبار سے اسلام ہمیں کیا بتاتا ہے۔ بلکہ اصول یہ ہے کہ جو کچھ اسلام سے براہِ راست معلوم ہو اس کو پاکستان کے مسلمان اختیار کرلیں۔ اور اپنے افکار و خیالات و مفادات و مصالح کو قربان کردیں۔"

کوثر کا جو نقطۂ نظر ہے وہ قوم کے لئے مفید ہے یا مضر[1] اور اسلام کی روح کے ساتھ ہم آہنگ ہے یا مخالف، اس وقت اس سے بحث نہیں۔ لیکن اگر اسلامی جماعت کا خیال ہے کہ قرار داد مقاصد پاس کردینے سے پاکستان کی مجلس آئین ساز نے برطانیہ اور پاکستان کے تعلقات کا ہمیشہ کے لئے فیصلہ کردیا۔ اور پاکستان کے معاشی اور اقتصادی نظام کے متعلق بھی سوچنے کا حق کھو دیا ہے تو ہم صرف اتنا کہیں گے۔ کہ یہ رائے نہ مجلس آئین ساز پاکستان کے کسی رکن کی ہے نہ پاکستانی جمہور کی۔

ہم اِسلامی جماعت کے ارباب حل و عقد سے مخلصانہ گذارش کریں گے کہ جس قسم کے انتہا پسندانہ اور غالی نقطۂ نظر کا اظہار کوثر میں ہوا ہے۔ اس کا اظہار جماعت کی بھی کوئی خدمت نہیں اسی طرح کے خیالات سے قوم کے سوچنے والے طبقے کے دل میں جماعت کی طرف سے خدشات اور ترددات پیدا ہوتے ہیں۔ آخر قومی "نفع و نقصان" کا سوچنا اور کسی امر کے "حسن و قبح" پر غور کرنا کوئی گناہ نہیں۔ بلکہ گناہ تو یہ ہوگا کہ قوم کے نمائندے نہ ان چیزوں پر غور کریں۔ نہ ہی دوسرے علماء کی بات سُنیں۔ بلکہ جو کچھ آپ فرمائیں اس پر بغیر سوچے سمجھے آمنا و صدقنا کی مہر لگادیں۔ آخر آپ سے بھی غلطیاں ہوئیں اور ہوسکتی ہیں اور ہوتی ہیں۔ مثلاً معرکہ پاکستان کے وقت آپ کا رویّہ کیا تھا، اسے اِسلامی جماعت سے باہر کونسا مسلمان صحیح ماننے کے لئے تیار ہے؟ — جہادِ کشمیر

---

[1] ملاحظہ ہو (صفحہ ۸۸ پر) استدراک۔

کے متعلق مولانا مودودی کا مہلک موقف کوئی پرانا واقعہ نہیں۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مومن ایک سوراخ سے دو دفعہ نہیں ڈسا جاتا۔ لیکن ان دو تلخ تجربوں کے بعد کس طرح دینی اور دنیوی امور کی باگ آپ کے ہاتھ میں دے کر آپ کو مطلق العنان بنایا جا سکتا ہے؟

اور اگر آپ کا یہ خیال ہے کہ قرار دادِ مقاصد آپ کو یہ حق بخشتی ہے تو سوائے اس کے کیا کہا جائے کہ آپ کا خیال غلط ہے!

استدراک: مسلمانوں کو اپنے "مفادات و مصالح قربان" کرنے کی جو مسلسل دعوت کوثر کے صفحات میں ہے۔ وہ جماعت کے باقی تمام لٹریچر میں بھی موجود ہے۔ پاکستان میں اس کا جو مضر اثر ہوتا ہوگا، ظاہر ہے لیکن شاید اس سے بھی دردناک صورت حالات ہندوستان میں ہے جہاں ارکینِ جماعت بڑے فخر سے غیر مسلم حکام سے کہتے ہیں کہ ہمیں مسلمانوں کے مادی اور سیاسی مفاد سے کوئی دلچسپی نہیں اور غیر مسلم حکام بھی سمجھتے ہونگے کہ ہندوستانی مسلمانوں کو ان کی سیاسی پستی اور غربت و افلاس پر قانع رکھنے کیلئے جماعت اسلامی سے بہتر کوئی ادارہ نہیں۔ ۱۷ اکتوبر ۱۹۵۲ء کے صدق جدید میں مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:-

امیر جماعت اسلامی کے لئے

"جماعت اسلامی وہ واحد ممتاز جماعت ہے جو مسلم قوم کے مادی اور فرقہ واری مفاد سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ خواہ یہ مفاد معاشری ہو یا سیاسی یا معاشی۔"

یہ وہ صفائی ہے جو اپنی جماعت کے غیر سیاسی اور صرف اخلاقی و انسانی مسلک کے متعلق جماعت اسلامی کے ایک رکن نے افسر کے سامنے پیش کیا۔ (جبکہ اور بھی طویل عبارتیں اسی مفہوم کے ساتھ جماعت کے ترجمانوں زندگی اور انصاف میں شائع ہو رہی ہیں) ـــــ اس سے قطع نظر کہ ایسی صفائی غیر مسلم حاکم کے سامنے پیش کرنا خودداری کے کہاں تک موافق تھا اصل سوال یہ ہے کہ مفادِ ملی کے ہر پہلو سے اتنی بے تعلقی و اعراض کے بعد جماعت کو عام اُمّت اسلامی سے کسی تعاون کی توقع کا حق ہی کیا باقی رہ جاتا ہے؟"

اسلامی جماعت کا طریقِ کار

ہم نے گذشتہ صفحات میں واقعات کا جو خلاصہ دیا ہے اس سے اسلامی جماعت کے اُن رجحانات کا اندازہ ہو گیا ہو گا۔ جو قیامِ پاکستان سے پہلے اور بعد میں ظہور پذیر ہوئے۔ لیکن ان میں زیادہ تر چیزیں ایسی ہیں جن کی حیثیت وقتی تھی۔ بلاشبہ ایک جماعت کا ماضی اس کے مستقبل کا غماز ہوتا ہے۔ لیکن ایک جماعت کے حسن و قبح کا اندازہ لگانے کے لئے اس کے عام طریق کار کی جانچ اور اُن نتائج و اثرات کا تجزیہ ضروری ہے۔ جو مستقبل میں اس کے پیشِ نظر ہوں۔

(۱) انتہا پسندی اسلامی جماعت کی سب سے نمایاں خصوصیت، جس پر کسی تفصیلی تبصرہ کی ضرورت نہیں۔ اِس کی انتہا پسندی ہے۔ اس خصوصیت کا ایک دلچسپ نتیجہ یہ ہے۔ کہ اگرچہ یہ جماعت مذہب اسلام کے شیدائی کی حیثیت سے میدان میں اُتری ہے۔ لیکن اِس کے انتہا پسندانہ طرزِ عمل کی وجہ سے تمام بڑے بڑے علماء اور بزرگانِ دین اس کے مخالف ہیں۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ کی رائے گذشتہ دَور میں جو حیثیت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کو حاصل تھی محتاجِ بیان نہیں۔ انہوں نے حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ جیسے بزرگوں سے فیض پایا۔ اور ایک عالم کو سیراب کیا۔ متعدد ضخیم معیاری کتب کے مصنف ہونے کے علاوہ انہوں نے علامہ شبیر احمد عثمانیؒ جیسے بزرگوں کی تربیت کی۔ ان کے خلیفہ اور سوانح نگار خواجہ عزیز الحسن مجذوب نے خاتمۃ السوانح میں اسلامی جماعت کے متعلق آپ کا قول نقل کیا ہے کہ میرا دل اس تحریک کو قبول نہیں کرتا۔ (ص ۲۴) اور مولانا عبد الماجد دریا بادی بھی ان کی نسبت لکھتے ہیں "حضرتؒ کا ذوقِ سلیم اِس زمانے میں اس جماعت کی طرف سے کھٹک گیا تھا۔ اور

حضرت کی فراست دینی اسی وقت "امیرِ جماعت" کی طرف سے بدگمان ہوگئی تھی۔ حالانکہ اس وقت تک جماعت کی طرف سے ان مفاسد کا ظہور نہیں ہونے پایا تھا۔ جو بعد کو ہوا" (صدق جدید۔ ۳۱ اگست ۱۹۵۱ء)

خانقاہ اشرفیہ تھانہ بھون کے مہتمم دارالافتا مولانا جمیل احمد تھانوی ایک استفتا کے جواب میں لکھتے ہیں :۔

" مودودی صاحب کی کتابوں کا مطالعہ اور اُن کی تحریک کی شرکت مسلمانوں کے دین کے لئے بہت مضر ہے۔ ان کتابوں میں صحابہ، تابعین، محدثین، آئمہ مجتہدین سے بے اعتمادی پیدا کرکے دین کے سارے ثبوت کو درہم برہم کیا گیا ہے۔ اور بہت سی باتیں ایسی لکھی ہیں کہ اگر دُور دُور تک کی تاویلیں کرکے نہ بچایا جائے۔ تو ایمان کے لئے بھی خطرناک ہیں مثلاً.....

مولانا مفتی کفایت اللہ کا فتویٰ مولانا مفتی کفایت اللہ، جو ایک عرصہ تک جمعیۃ العلمائے ہند کے صدر رہے۔ اور اب بھی دہلی میں مفتیٔ اعظم گنے جاتے ہیں۔ ایک استفتا کے جواب میں فرماتے ہیں :۔

" مودودی جماعت کے افسر مولوی ابوالاعلیٰ مودودی کو میں جانتا ہوں۔ وہ کسی معتبر اور معتمد علیہ عالم کے شاگرد اور فیض یافتہ نہیں ہیں۔ اگرچہ ان کی نظر اپنے مطالعہ کی وسعت کے لحاظ سے وسیع ہے تاہم دینی رجحان ضعیف ہے۔ اجتہادی شان نمایاں ہے۔ اور اسی وجہ سے ان کے مضامین میں بڑے بڑے علمائے اعلام بلکہ صحابہ کرام پر بھی اعتراضات ہیں۔ اس لئے مسلمانوں کو اِس تحریک سے علیحدہ رہنا چاہیئے۔ اور ان سے میل جول، ربط و اتحاد نہیں رکھنا چاہیئے۔ ان کے مضامین بظاہر دلکش اور اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ مگر ان میں ہی وہ باتیں دل میں بیٹھ جاتی ہیں جو طبیعت کو آزاد کر دیتی ہیں۔ اور بزرگانِ اسلام سے بدظن بنا دیتی ہیں۔"[۱]

---

[۱] ملاحظہ ہو۔ فتویٰ شائع کردہ حاجی انعام خاں۔ سہارنپور

علمائے دارالعلوم دیوبند کا فتویٰ علمائے دیوبند کی بھی جماعت اسلامی کی نسبت یہی رائے ہے۔ مارچ ۱۹۵۱ء میں حافظ ظہور احمد صاحب پیش امام قصبہ شاہ پور نے جماعتِ اسلامی کی نسبت رائے دریافت کی۔ جواب میں مفتی سید مہدی حسن نے کہا:۔

"اِس جماعت کی کتابیں عوام کو نہ پڑھنی چاہئیں اور نہ جماعت میں داخل ہونا چاہئے۔ مودودی صاحب کے مضامین اور کتابوں میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جو اہلِ سنت والجماعت کے طریقہ کے خلاف ہیں۔ صحابہ کرام اور آئمہ مجتہدین کے متعلق ان کا اچھا خیال نہیں ہے۔ احادیث کے سلسلے میں بھی ان کے خیالات ٹھیک نہیں ہیں۔ بے عمل مسلمانوں کو بھی وہ مسلمان نہیں سمجھتے ہیں۔ غرض بہت سی باتیں ہیں جو خلاف ہیں۔ اس لئے مسلمانوں کو اس جماعت سے علیحدہ رہنا چاہئے"

دوسرے بزرگوں کی بھی یہی رائے تھی مثلاً مولانا اعزاز علی امروہوی (بہ تائید مولانا فخرالحسن مدرس دارالعلوم دیوبند) اسی استفتا کے جواب میں جماعت اسلامی کے متعلق فرماتے ہیں:۔

"افسوس ہے کہ میں ضیق وقت سے مجبور ہوں۔ ورنہ اہلِ اسلام کے سامنے اس زہر کو پیش کرتا جو کہ اس جانب سے شہد میں ملا کر مسلمانوں کے سامنے لایا گیا ہے۔ اِس لئے بالاختصار اسی قدر عرض کرتا ہوں۔ کہ میرے نزدیک یہ جماعت اپنے اسلاف (یعنی مرزائی جماعت) سے بھی مسلمانوں کے دین کے لئے زیادہ ضرر رساں ہے" لے

مولانا محمد الیاس بانی تبلیغی جماعت کے جانشین کی رائے "تبلیغی جماعت" کے مشہور و معروف بانی حضرت مولانا محمد الیاس مرحوم کے صاحبزادے مولانا محمد یوسف صاحب اپنے مقدس والد کے

لہ و لہ ملاحظہ ہو۔ کشفِ حقیقت یعنی تحریک مودودیت اپنے اصل رنگ میں

مرتبہ مولانا سعید احمد مفتی اعظم مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور

نقشِ قدم پر چل کر دعوت وارشاد کا وظیفہ بجا لانے میں مصروف ہیں۔ پچھلے دنوں جب سکھر میں تبلیغی جماعت کی ایک کانفرنس ہوئی۔ تو "جماعتِ اسلامی سکھر" نے اس کانفرنس کے احاطے میں اپنے مکتبہ کا سٹال لگانے کی اجازت طلب کی۔ لیکن مولانا محمد یوسف نے اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ اور فرمایا کہ "آپ لوگ ایک سیاسی جماعت ہیں"۔ اور

"آپ حکومت کے طالب ہیں آپ اِس چیز کے طالب ہیں جو مردود ہے۔ حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوّتِ حکومت پیش کی گئی۔ مگر آپ نے اُسے رَد کر دیا۔ ٹھکرا دیا۔ اور نبوّتِ عبدیت قبول کی۔ آپ کا یہ خیال کہ حکومت اور بادشاہت میں تبدیلی ہو جائے۔ تو اسلام زندہ ہو جائے گا۔ بالکل غلط ہے"۔

حاضرین میں سے کسی نے سوال کیا۔ کہ "کلمۃ الحق عند سلطان جائر" کے کیا معنی ہیں آپ نے فرمایا

یہ اس وقت کے لئے ہے جب پورا معاشرہ درست ہو۔ اور صرف حکومت میں خرابی نظر آتی ہو۔ اُس وقت کلمۂ حق کہنا درست ہے۔ تاکہ جو خرابی ابھی صرف حکومت تک محدود ہے۔ وہ آگے نہ بڑھنے پائے۔ اِس وقت یہ موقع نہیں ہے۔

اس کے بعد مولانا محمد یوسف نے غالباً جماعتِ اسلامی کے کارکنوں کے غیر عادلانہ طرزِ تنقید اور اُن غیر اسلامی چالوں کو پیش نظر رکھ کر جو وہ اپنے مخالفین یا حکومتِ پاکستان کے خلاف اختیار کرتے ہیں۔ یہ فرمایا۔

اِس وقت جو لوگ برسرِ اقتدار ہیں۔ وہ ہم سے بہتر ہیں۔ ایمان میں اعمال میں۔ تدبیر میں اور قابلیت میں وہ آپ سے بہتر ہیں آپ ان کے بجائے کون سے لوگ لائیں گے؟[1]

---

[1] ان اقتباسات کے لئے ملاحظہ ہو۔ ترجمان القرآن اپریل۔ مئی ۱۹۵۲ء (ص ۱۱۴)

غرض مولانا نے جماعتِ اسلامی کے کارکنوں کو خاصا دندان شکن جواب دیا اور ان کی ذہنیت اور ان کے عزائم کو بڑی جرأت اور صاف گوئی سے واضح کر دیا۔

مولانا سید سلیمان ندوی کی رائے تمام قدیم راسخ العقیدہ علماء جماعت کے مخالف ہیں۔ لیکن جماعت کی رفتارِ کار کا یہ عالم ہے۔ کہ جدید رنگ کے مولوی یعنی علمائے ندوہ بھی اس تحریک کے خلاف ہیں۔ فی الحقیقت ندویت اور مودودیت کی تحریک میں بہت سی باتیں مشترک ہیں (اور عجیب اتفاق ہے کہ جن الفاظ میں مولانا رشید احمد گنگوہی ؒ نے تحریک ندویت کے متعلق اپنے خدشات کا اظہار کیا تھا قریباً انہی الفاظ میں مولینا اشرف علی تھانوی ؒ نے تحریک مودودیت کے متعلق اپنے شبہات بیان کیے ہیں) ۔ (۱) تحریک ندویت کا ابتدائی مقصد کچھ اور تھا۔ لیکن اس کے سیاسی اور اجتماعی مقاصد کا ہیولیٰ پروفیسر شبلی نے مرتب کیا۔ جن کی قابلیت اور کمالِ انشاء پردازی میں شبہ نہیں۔ لیکن جنہوں نے قدیم علمائے دین کے ہاں وہ روحانی تربیت حاصل نہ کی تھی۔ جو طبیعت میں خدا ترسی۔ تقویٰ اور احتیاط پیدا کر دیتی ہے۔ اور انا اور ذاتی پرخاش اور خواہشات کو مناسب حدود سے بڑھنے نہیں دیتی بالکل یہی کیفیت مولانا مودودی کی ہے۔ (۲) تحریک ندویت بھی (مولانا شبلی کے زیرِ اثر) ایک لحاظ سے نیم سیاسی تحریک ہو گئی تھی۔ جس کا مقصد قوم کی قیادت قوم کے سیاسی راہنماؤں سے چھین کر علما کے ہاتھ میں دینا تھا۔ یہی مقصد مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کا ہے۔ چنانچہ یہ امر محض اتفاقی نہیں کہ جن لوگوں نے اسلامی جماعت کی دعوت پر سب سے پرجوش طریقے سے لبیک کہا۔ ان میں پیش پیش یا تو وہ بزرگ تھے۔ جو (مولانا مسعود عالم ندوی کی طرح) ندوۃ العلماء کے تربیت یافتہ تھے۔ یا (مولینا امین احسن اصلاحی کی طرح) ان درس گاہوں کے کھاٹے سر سبد تھے۔ جنہیں (مدرسۃ الاصلاح سرائے میر ضلع اعظم گڑھ کی طرح) ندوۃ العلما کی شاخیں سمجھنا چاہیے۔

ندویت اور مودودیت میں کئی باتیں وجہ اشتراک ہیں لیکن مولانا مودودی اور اسلامی جماعت

کی انتہا پسندی کا یہ عالم ہے۔ کہ سید سلیمان ندوی جیسے مربیان ندوہ کو بھی ان کے طریق کار سے اختلاف کرنا پڑا۔ مثلاً اسلامی نظریۂ سیاست کے مقدمہ میں انہوں نے (نام لئے بغیر) ان اصولوں کے خلاف اظہار خیال کیا۔ جو نظام سیاسی کے متعلق اسلامی جماعت سے منسوب کئے جاتے ہیں[۱]۔ اور جیسا کہ مولانا مناظر احسن گیلانی نے ایک سلسلۂ مضامین میں کہا عام طور پر سید سلیمان ندوی کو جماعت کے مخالفین میں سے شمار کیا جاتا ہے[۲]۔

نئے فتنۂ خارجیت پر مولانا عبد الماجد دریا بادی کے خیالات

سید سلیمان ندوی تو اب پاکستان آگئے ہیں۔ ہندوستان میں اس وقت دار المصنفین کے سرپرست، رسالہ معارف کے نگراں اور ندوی طریقِ خیال کے سب سے با اثر ترجمان مولانا عبد الماجد دریا بادی ہیں انہوں نے ایک زمانے میں مولانا مودودی کے لئے "متکلم اسلام" کا خطاب وضع کیا تھا۔ لیکن ان کے بعد کے خیالات و اقدامات سے وہ اس طرح برگشتہ ہوئے۔ کہ اب وہ مولانا مودودی کی تحریک کو ہمیشہ خارجیت سے تشبیہ دیتے ہیں۔ (یہ تشبیہ بعض اعتبارات سے موزوں ہے۔ کیونکہ خوارج کی جماعت علم و فضل زہد و تقویٰ اور غیرت دینی کی نمائش کے باوجود اسلامی حکومت اور مسلم معاشرے کے لئے نہایت مضرت رساں اور فتنہ پرور تھی) چنانچہ مولانا صدق کے ایک پرچے میں فرماتے ہیں :-

"سن ۳۷ ہجری ہے۔ اور دورِ علی مرتضیٰؓ کی خلافت راشدہ کا۔ عراق عرب کی سرحد پر ایک خاتون سواری پر سوار اور پیدل ان کے شوہر نامدار چلے جا رہے ہیں "دیندار" مسلمانوں کے ایک پُرجوش گروہ نے انہیں دیکھ لیا۔ اور اپنے حلقہ میں اس طرح لے لیا جیسے مجرموں کو گھیرے میں لے کر چلتے ہیں

---

[۱] ملاحظہ ہو۔ آفاق ۸ر جنوری ۱۹۵۰ء میں مولانا محمد سرور کا مضمون "مولانا سید سلیمان ندوی کے ارشادات کاش جماعت اسلامی کے بزرگ ان پر غور کریں۔" [۲] صدق لکھنؤ - ۱۸ر اگست ۱۹۵۰ء

راہ میں اتفاق سے ایک باغ پڑا - اور عین اس وقت ایک تازہ کھجور درخت سے گری - جماعت میں سے کسی نے اٹھا کر منہ میں رکھ لی - معاً ساتھیوں نے للکارا اور کہا "خبردار یہ اکل حلال نہیں" اور اسی لمحہ اس نے کھجور کو منہ سے تھوک دیا - اللہ اکبر یہ کیسے متقی لوگ تھے - آگے بڑھے ایک عیسائی کا پالا ہوا سوٗر سامنے سے گذرا - کسی نے اُس پر تلوار چلا دی - اس کے ساتھ والوں نے تنبیہہ کی کہ تم نے یہ کیا فساد فی الارض کر دیا - وہ بیچارہ نادم و مستغفر مالک کے پاس گیا - اور جب تک اسے راضی نہ کر لیا - عذر و معذرت ہی کرتا رہا - العظمۃ للہ - کیا ٹھکانا اس تقوے و خشیت کا ! گروہ اور آگے بڑھا - اور اب کیا دیکھنے میں آتا ہے کہ "اتقیا" کا گروہ اشقیا کا گروہ نکلا اور انسان درندے بن گئے - اور دونوں مجرم وہیں اٹھا کر پٹخے گئے - میاں کو کروٹ کے بل لٹا کر ذبح کر دیا گیا اور خاتون جو حاملہ تھیں ان کا پیٹ پھاڑ کر کام تمام کر دیا گیا -

"جماعت" والوں کو آپ نے پہچانا - یہ وہ بزرگوار تھے جنہیں تاریخ خوارج کے نام سے پکارتی ہے - اور جن کا نعرۂ ملی تھا اِنِ الحکمُ اِلّا لِلّٰہ اور وہ دونوں مجرم ایک صحابی رسول عبداللہ بن جندبؓ تھے - اور دوسری خاتون محترم ! اور جرم دونوں کا یہ اور صرف یہ کہ وہ عثمان غنیؓ اور علی مرتضےٰؑ (نعوذ باللہ) کے کفر و ارتداد کے نہیں بلکہ ایمان اور کمال کے قائل تھے - یہ واقعہ خارجیوں کی تاریخ میں انوکھا کب ہے - ۳۰ - ۴۰ سال تک جب تک ان کا زور رہا اس کے سوا ہوتا کیا رہا - زبانوں پر وہی نعرے اِنِ الحکمُ اِلّا لِلّٰہ کے اور ہاتھ مسلمانوں کے گلے کاٹنے، ان پر نیزے چلانے اور ان کے خنجر بھونکنے میں مصروف - مفر نہ کسی تابعی کو نہ صحابی کو - اور سب سے زیادہ جوش و خروش خلیفۂ برحق علی مرتضےٰؑ کے مقابلہ میں - بس اس مسلم کشی کے سوا اپنی ساری تاریخ میں مقابلہ و مقاتلہ نہ کسی مجوسی سے نہ یہودی سے نہ مسیحی سے - سارا جہاد و قتال مسلمانوں ہی کے مقابلہ میں آج تیرہ سو برس کے بعد وہی نعرے جب اس بے پناہ جوش و خروش کے ساتھ زبانوں پر جاری

ہوتے ہیں تو آخر تاریخ کیوں نہ اپنے کو دہرائے اور حریف اور مقابل کے لئے بجائے "قومی" اور "نسلی" مسلمانوں کے کسی غیر مسلم کی تلاش کیوں ہو"۔ [۱]

مولانا عبدالباری ندوی کا بیان | اربابِ ندوہ میں مولانا عبدالباری کا جو مرتبہ ہے۔ وہ محتاجِ بیان نہیں - وہ ایک صاحبِ تقویٰ بزرگ اور اسلامی طریقِ کار کے شیدائی ہیں - انھوں نے جماعتِ اسلامی کی ان کوششوں کی علانیہ تعریف کی ہے - جو اس نے نئے طبقہ میں اسلام کا پیغام پہنچانے کے سلسلے میں کیں - لیکن مولانا مودودی اور ان کے رفقائے کار کا ذہنی تجزیہ ان کے قلم سے پڑھیئے :-

بلاشبہ جماعت کے بانی اور بہت سے اساطین خود علمی وعملی تربیت وصحبت سے محروم ہونے اور نرے کتابی علم و ذہانت کے زور میں کہیں سے کہیں نکل گئے اور بہت سی مہلک بے اعتدالیوں کا شکار ہو کر اپنے اور دوسروں کے لئے "نیم ملا خطرہ ایمان" بن گئے ہیں" [۲]

اِسلامی جماعت کے بُنیادی نظریۂ "حکومتِ الٰہیہ" کو بھی مولانا عبدالباری مذہب اسلام کا جزو نہیں سمجھتے - وہ ایک خط میں مولانا عبدالماجد دریابادی کو لکھتے ہیں :-

پچھلے صدق میں آپ کے صوفی نذیر احمد صاحب نے خاکسار کے بالکل دل کی اور بڑے پتہ کی بات کہہ دی - کہ حکومت الٰہیہ دین کے اصلی اجزاء میں سے نہیں - جزاہُ اللہ" [۳]

علامہ مناظر احسن گیلانی مدظلہ، کے ارشادات | دورِ حاضر کے علماء میں مولانا مناظر احسن صاحب ایک بڑے پایہ کے بزرگ ہیں - نہ صرف ان کی نظر قدیم عربی کتب پر بڑی گہری ہے - بلکہ خدا نے انہیں ذہن رسا اور ایک دلنشیں اندازِ تحریر عطا کیا ہے - وہ مولانا مودودی کو ایام حیدر آباد سے

---

[۱] منقولہ از نوائے وقت بابت ۲۷ر نومبر ۱۹۴۸ء - [۲] صدق جدید لکھنؤ ۱۴ر دسمبر ۱۹۵۱ء
[۳] صدق جدید لکھنؤ ۹ر فروری ۱۹۵۱ء

جانتے ہیں - ان کے قدر دانوں میں سے ہیں - اور ایک مرتبہ صدق جدید میں انہوں نے جماعت اسلامی کے آئندہ طرزِ عمل کی نسبت اپنے خدشات بیان کئے - تو ساتھ ہی ساتھ یہ بھی واضح کر دیا - کہ میں مولانا مودودی یا اُن کے رفقائے کار کو خارجی نہیں سمجھتا[1] - لیکن مولانا مودودی کے مداحوں کو بڑی دشواریوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے - مولانا میں بڑی خوبیاں ہیں - لیکن حقیقت پسندی (REALISM) کا ان کے ہاں فقدان ہے - اور منطقی دلائل کی بنا پر وہ ایسے ایسے شوشے چھوڑ دیتے ہیں - کہ اُن پر سوائے اُن کے غالی عقیدتمندوں کے، کسی کو قائل کرنا مشکل ہوتا ہے - جہاد کشمیر کے متعلق انہوں نے جس نقطۂ نظر کا اظہار کیا - وہ مولانا کے رنگِ طبیعت کا ایک چونکا دینے والا نمونہ تھا - لیکن یہ مسئلہ پاکستان کے متعلق تھا - مولانا مناظر احسن اس پر خاموش رہے - ۱۹۵۱ء میں مولانا مودودی نے ایک ایسے مسئلہ پر قلم اُٹھایا - جو ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے بڑی اہمیت رکھتا تھا - جون ۱۹۵۱ء کے ترجمان القرآن میں ہندوستان اور پاکستان کے مسلمانوں کے تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے مولانا مودودی نے لکھا "جہاں تک مجھے معلوم ہے - قرآن کا منشا یہی ہے - کہ دارالاسلام اور دارالکفر کے مسلمانوں میں وراثت اور شادی بیاہ کے تعلقات نہ ہوں" بلکہ یہ بھی لکھ دیا - "اگر زوجین میں سے ایک دارالاسلام میں ہجرت کر آیا ہے - اور دوسرا ہجرت پر تیار نہ ہو - تو عدالت میں اس بنیاد پر درخواست دی جا سکتی ہے - اور ایسے زوجین کا نکاح فسخ کیا جا سکتا ہے"

---

[1] (ملاحظہ ہو صدقِ لکھنؤ - ۱۵ اگست ۱۹۵۰ء) اس پر مولانا عبدالماجد دریا بادی کا حاشیہ تھا "سوال یہ او صرف یہ ہے کہ کج خوارج کے شعار (SLOGAN) ان الحکم الا للہ کی جو تجدید مع اس کے انہی قدیم تضمنات، مضمرات و مطالبات کے ہو رہی ہے - (مثلاً جمہور مسلمین کے جذبۂ دینی کی تحقیر، او عملاً ان کو غیر مسلموں کے ہم سطح قرار دے دینا) اس کے بعد اس جدید گروہ اور قدیم مگر بدنام گروہ (خوارج) کے درمیان آخر فرق کیا - اور کس حیثیت سے باقی رہ جاتا ہے؟"

اِن مہاجرین کے متعلق، جن کے رشتہ دار دارالکفر میں رہ گئے ہوں آپ نے تحریر فرمایا۔ "انکے بارے میں بھی میرا خیال یہی ہے۔ کہ نہ وہ ہندوستان میں میراث پا سکتے ہیں۔ اور نہ ان کے ہندوستانی رشتہ دار پاکستان میں ان سے میراث پانے کا حق رکھتے ہیں"

اب تو مولانا مناظر احسن صاحب سے بھی نہ رہا گیا۔ اور انہیں بھی مولینا مودودی کے طریق کار اور نقطہ نظر کی نسبت قریب قریب وہی الفاظ استعمال کرنے پڑے۔ جو مولینا عبدالماجد دریابادی عام طور پر کرتے ہیں۔ مولانا مودودی کے فتوے کے متعلق اطلاع پاکر مولانا مناظر احسن نے صدق میں دو مضامین لکھے۔ پہلے کا عنوان تھا:۔

خارجیت کا نیا مظاہرہ

اور مضمون کا آغاز تھا :۔

"اس زمانہ میں بڑھ بڑھ کر باتیں بنانے والوں کو دیکھ کر بیساختہ غالب مرحوم کے فرضی معشوق کی عادتیں یاد آجاتی ہے۔ لیکن سادہ لوحن کو تو چھوڑیئے کتنے بڑے ظلم کا ارتکاب وہ کر رہے ہیں۔ جو جان بوجھ کر ایسے ایسے نادر مسائل اور قرآنی آیات کے ان پہلوؤں کو پیش کر رہے ہیں۔ جن کو سُن سُن کر ایک مسلمان کی دینی زندگی بھی جس پر وہ آخری ٹیک لگا سکتا تھا۔ کرب و بے چینی کی زندگی بن جاتی ہے۔"

اس کے بعد مولانا نے مسئلہ اختلاف دارین میں اپنی رائے دی اور پھر ایک آیت "من لم یحکم بما انزل اللہ (الآیہ) کے ضمن میں علامہ ابوبکر جصاص کی تفسیر سے اقتباس دیتے ہوئے جماعت اسلامی کے متعلق کہتے ہیں :۔

خارجیت کے ذکر سے ان میں برہمی پیدا ہوتی ہے ...... بتایا جائے۔ کہ آج بھی مسلمانوں کو پریشان کرنے کے لیے اس آیت کا استعمال جس طریقے سے کیا جا رہا ہے اگر دیکھنے والوں کو

اِس میں خارجیت کا رنگ نظر آتا ہے۔ تو یہ نقطہ نظر کیا نیا نقطہ نظر ہے؟ علامہ جصّاص بھی تو یہی فرما رہے ہیں"۔

اس کے بعد مولانا مناظر احسن نے جماعت کی انتہا پسندی کا امام ابوحنیفہؒ اور قدیم فقہا کے طریق کار سے موازنہ کیا۔ اور اس بات پر افسوس کا اظہار کیا۔ کہ اب صرف اُن چیزوں کی طرف توجہ ہوتی ہے۔ جن سے مسلمانوں کی اُلجھنیں اور مشکلات بڑھیں۔ وہ فرماتے ہیں:۔

"ضرورت جب ہوتی ہے۔ تو فقہ کی کتابوں سے مسئلہ نکال نکال کر مسلمان خاتونوں کا نکاح اُن کے مسلمان شوہروں سے توڑتے ہیں۔ لیکن اِسی فقہ حنفی میں اِس قسم کے مسائل پر ان کی نظر نہیں پڑتی کہ غیر مسلم کی شراب کے ڈھونے یا اس کے سُوروں کو چرانے یا شراب بنانے کے لئے اس کے انگوروں کو نچوڑنے کی ملازمت مسلمانوں کے لئے امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک صرف جائز ہی نہیں۔ بلکہ ہدایہ کے متن میں ہے۔ یطیب لہ الاجر (معاوضہ اس کے لئے پاک ہوگا)"[1]

اِس کے بعد مولانا نے شمس الائمہ سرخسیؒ کی کتاب سے استحسان کے متعلق ذیل کا اندراج نقل کیا ہے:۔

عام لوگوں کے مناسب جو پہلو ہو اس کو اختیار کرنا یا ان احکام میں جن میں عوام و خواص مبتلا ہوں سہولت کے پہلو کو تلاش کرنا یا فراخی اور آسانی یا چشم پوشی اور اس طریقہ کو اختیار کرنا جس میں راحت اور چین ہو۔ اِن ہی الفاظ میں علماء نے استحسان کی تعریف کی ہے۔ حاصل سب کا یہی ہے۔ کہ دشواری کو چھوڑ کر آسانی کی راہ اختیار کی جائے کہ یہی دین کی اصل ہے۔ خود خداوند تعالیٰ کا اِرشاد ہے کہ یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر (خدا تم سے آسانی کا خواستگار ہے۔ دشواری میں ڈالنا نہیں چاہتا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اچھا دین

---

[1] صدق - ۱۵ فروری ۱۹۵۲ء

وہی ہے جس میں آسانی ہو۔ حضرت معاذ اور علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو رخصت کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ تم دونوں آسانی کی راہ اختیار کیجیو لوگوں کو دشواری میں نہ ڈالنا نزدیک لانے کی کوشش کیجیو لوگوں کو بھگا نا مت"۔ اختلافِ دارین کے مسئلے پر مولانا مناظر احسن کا دوسرا مضمون ایک مہینہ بعد شایع ہوا۔ عنوان تھا۔

مولانا مودودی کا تازہ اجتہاد

یک نہ شد دو شد

اِس میں زیادہ تر مسئلہ وراثت سے بحث کی گئی تھی۔ اور یہ بتایا تھا کہ مولانا مودودی نے جو رائے ظاہر کی تھی، "حنفی فقہ کی کتابوں میں مسئلہ اس کے بالکل برعکس پایا جاتا ہے"۔ اور فقہی کتب کے اقتباسات دے کر، ان حالات کی طرف اشارہ کیا۔ جو پاکستان اور ہندوستان میں وجہ اشتراک ہیں۔ اور بڑے دکھ سے یہ کہہ کر اپنے مضمون کو ختم کیا۔

"......کوئی وجہ نہیں۔ کہ واقعات سے خواہ مخواہ چشم پوشی کر کے فتوے صادر کیے جائیں۔ فقط"۔

اِن دو مسائل کے متعلق مولانا مودودی کا اندازِ خیال اِس قدر غلط اور خطرات سے پُر تھا۔ کہ دوسرے علماء نے بھی انہیں متنبہ کیا۔

چنانچہ ترجمان القرآن میں مولانا ظفر احمد تھانوی اور مولانا مودودی کی (نامکمل[1] اور ترمیم شدہ[2]) خط و کتابت شایع ہوئی تھی) اور بالآخر مولانا مودودی کو تسلیم کرنا پڑا۔ کہ ان کی رائے فتویٰ کی حیثیت نہیں رہتی۔ چنانچہ مولانا ظفر احمد تھانوی نے انہیں لکھا۔

---

[1] صدق جدید لکھنؤ - ۴ ر اپریل ۱۹۵۲ء

[2] ترجمان القرآن جلد ۳۶ - عدد ۵ ، ۶ ھ ۱۳۷۵ (ص ۹)

"........ جب آپ اپنی کسی تحقیق کو حرفِ آخر اور فتویٰ نہیں سمجھتے محض اظہار رائے کے طور پر بیان کرتے ہیں۔ تاکہ اہلِ علم اس پر غور کریں۔ تو علماء عصر نے خواہ مخواہ آپ کے خلاف ایک محاذ قائم کرلیا۔

خیر خواہی سے عرض کرتا ہوں کہ گو آپ کو زحمت تو ہوگی۔ مگر ہر اظہار رائے کے ساتھ اس حقیقت کی تصریح بھی ہو جایا کرے۔ تو زیادہ بہتر ہو تاکہ فتنہ اور غلط فہمی پیدا نہ ہو"[۳]

۶۔ جمہوری حقوق کی مخالفت

جماعت اسلامی کے اس لٹریچر کو جو گذشتہ آٹھ دس سال میں شائع ہوا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو نظر آتا ہے۔ کہ جس بات پر مولانا مودودی سب سے زیادہ زور دیتے رہے ہیں وہ حاکمیت جمہور کا انکار ہے۔ جب مولانا نے اکتوبر ۱۹۴۵ء میں انتخابات کی شرکت اور رائے دہی کو یکم قلم حرام قرار دیا اور کہا کہ خواہ ان انتخابات کا اثر قوم یا ملک کی قسمت پر کچھ بھی ہو وہ اس میں شرکت کے لئے تیار نہیں تو انہوں نے اپنے نقطہ نظر کی وضاحت حسب ذیل الفاظ میں کی ہے۔

"موجودہ نظام کے خلاف ہماری لڑائی ہی اس بنیاد پر ہے کہ یہ نظام حاکمیت جمہور پر قائم ہوا ہے اور جس پارلیمنٹ یا اسمبلی کو عوام منتخب کریں۔ اس کو قانون بنانے کا غیر مشروط حق دیتا ہے جس کے لئے کوئی بالاتر سند اس کو تسلیم نہیں۔ برخلاف اس کے ہمارے عقیدہ توحید کا بنیادی تقاضا ہے کہ حاکمیت جمہور کی نہیں بلکہ خدا کی ہو اور آخری سند خدا کی کتاب کو مانا جائے اور قانون سازی جو کچھ بھی ہو کتاب الٰہی کے ماتحت ہو۔ نہ کہ اس سے بے نیاز"

جب مسلم لیگ کے حامیوں نے اس کے جواب میں کہا کہ اگر "ممبران اسمبلی کو قانون سازی کا

---

[۳] صدق جدید لکھنؤ - ۱۴ر اپریل ۱۹۵۲ء

غیر مشروط حق حاصل ہے تو اس حق کا غیر مشروط ہونا ہی اس امر کی کافی ضمانت ہے کہ یہ لوگ صحیح قانون مرتب کرنے میں آزاد ہوں گے اور ایسا قانون بنا سکیں گے۔" جس میں آخری سند خدا کی کتاب کو مانا جائے اور قانون سازی جو کچھ بھی ہو کتابِ الٰہی کے ماتحت ہو۔ نہ کہ اس سے بے نیاز۔ اور ظاہر تھا کہ جن قانون ساز مجلسوں میں مسلمانوں کی واضح اکثریت ہو گی وہ اپنے قوانین کو کتاب الٰہی کے ماتحت رکھنے کی کوشش کریں گے۔ لیکن مولانا مودودی نے اس دلیل کو قبول نہ کیا۔ اور کہہ دیا کہ یہ "طریقہ کارِ اسلامی جماعت کے لئے مفید نہیں۔"

یہ نقطۂ نظر اسلامی جماعت کے لٹریچر میں بار بار آتا ہے۔ اور فی الحقیقت جماعت کے لئے بنیادی اصول کی حیثیت رکھتا ہے۔ جماعتِ اسلامی (صوبہ سندھ) کے شعبۂ نشر و اشاعت نے "جماعت اسلامی کی تاریخ و دعوت" کے متعلق ایک پمفلٹ جنوری ۱۹۴۹ء میں شائع کیا تھا۔ اِس میں زیادہ تر خود مولانا مودودی کی تصانیف سے اندراجات نقل کر کے جماعت کے نقطۂ نظر کو واضح کیا۔ اس کے بالکل آغاز میں بلکہ پیشِ لفظ سے بھی پہلے جماعت کی طرف سے اس بنیادی نقطۂ نظر کا اظہار ہے۔"

"دنیا کو جو سیاسی مسائل درپیش ہیں۔ ان کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کو جو حیثیت فی الواقع حاصل نہیں تھی اسے خواہ مخواہ اپنی حیثیت بنا لینے پر اس نے اصرار کیا۔"

مسلم لیگ کا ۱۹۴۶ء میں یعنی الیکشن کے موقع پر جو نقطۂ نظر تھا وہی آج ہے۔ اس وقت بھی مولانا مودودی سے کہا گیا تھا کہ مسلمان ممبران کا قانون سازی کا حق اس امر کی کافی ضمانت ہے۔ کہ وہ قانون سازی کتاب الٰہی کے تابع ہو کر کریں گے۔ اور قرارداد مقاصد میں اسی اصول کی عملی تشکیل ہے مولانا مودودی نے ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ کے نقطۂ نظر کی سخت مخالفت کی اور یہ ماننے سے انکار کر دیا کہ پاکستان کا حصول اور ایک ایسی ریاست کا قیام جس میں مسلمان برسرِ اقتدار ہوں گے اسلامی

نظام کے قیام کے لئے خشت اوّل کی حیثیت رکھتا ہے۔ خود مسلم لیگ کے متعلق کہا کہ اسلام اور اس کے مقاصد سے "لیگ کی تحریک مسلمانوں کو کوسوں دُور لئے جا رہی ہے"۔[1] اور پاکستان کی نسبت فرمایا کہ یہ ممکن نہیں کہ آزاد پاکستان کے نظام کو اسلامی دستور میں تبدیل کیا جا سکے۔ کیونکہ "جنت الحمقا میں رہنے والے لوگ اپنے خوابوں میں خواہ کتنے ہی سبز باغ دیکھ رہے ہوں۔ لیکن آزاد پاکستان (اگر فی الواقع وہ بنا بھی) تو لازماً جمہوری لادینی اسٹیٹ کے نظریہ پر بنے گا"۔[2]

خدا کا شکر ہے کہ مولانا مودودی کی پیش گوئی غلط ثابت ہوئی آزاد پاکستان قائم ہوا۔ مسلم لیگ نے ۱۹۴۶ء میں کتاب الٰہی کے ماتحت قانون سازی کے جو وعدے کئے تھے ان کی عملی صورت روز بروز ہمارے سامنے آرہی ہے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ جو راستہ لیگی حکومت نے قرارداد مقاصد میں اپنے لئے معین کیا ہے۔ وہ اس راستہ سے مختلف ہے جس پر جماعت اسلامی ملک اور قوم کو چلانا چاہتی تھی قرارداد مقاصد میں قانون سازی کا حق اسمبلی یا جمہور کے نمائندوں کو ملا ہے۔ گو اس حق پر چند پابندیاں ہیں۔ لیکن ان پابندیوں کے ماتحت قانون سازی کا حق جمہور کے نمائندوں کا ہے۔ اسلامی جماعت کے نزدیک عملی طور پر یہ حق جمہور کے نمائندوں کا نہیں۔ بلکہ اسلامی نظام کے ماہرین یعنی علماء کا ہے۔ ۱۹۴۸ء ہی میں ادارہ فلاح انسانیت کراچی نے[2] "دو دستوری خاکے" کے عنوان سے مسٹر محمد اسد اور مولانا مودودی کی تصانیف سے "دو دستوری" خاکے اخذ کر کے شائع کئے تھے۔ ان میں قانون سازی کے متعلق مندرجہ ذیل اصول مولانا کی مختلف کتابوں سے حرف بحرف نقل کر کے درج ہیں :-

---

[1] ترجمان القرآن جلد ۲۸ عدد ۲ ص ۱۶۳ [2] معلوم ہوتا ہے کہ جماعت اسلامی کراچی شہر نے ہی "ادارہ فلاح انسانیت" کا نقاب اوڑھا ہوا تھا۔ حال ہی میں یہ رسالہ دس ہزار کی تعداد میں مکتبہ چراغ راہ نے شائع کیا ہے۔ ابتدا میں

"(دفعہ ۳۹) "قانون سازی کے اختیارات خدا کے سوا کسی کو حاصل نہ ہوں گے۔ سارے مسلمان مل کر بھی نہ اپنے لئے کوئی قانون بنا سکتے ہیں اور نہ خدا کے بنائے ہوئے قانون میں کوئی ترمیم کر سکتے ہیں۔"

(دفعہ ۴۰) "خدا اور رسولؐ کے واضح احکام میں امیر یا قانونیہ یا کسی مجتہد یا عالمِ دین بلکہ تمام مسلمانوں کو مل کر بھی یک سر مو ترمیم کرنے کا حق حاصل نہ ہوگا۔"

(دفعہ ۴۱) "خدا اور رسول کے وہ احکام جن میں دو یا زیادہ تعبیریں ممکن ہوں۔ ان میں شریعت کا منشا معلوم کرنے کا کام مجلس شوریٰ کی ایک ایسی سب کمیٹی کے سپرد ہوگا جو ان علماء پر مشتمل ہوگی جو اجتہاد کی صلاحیت اور قابلیت رکھتے ہوں۔"

(دفعہ ۴۲) جن امور کے متعلق شریعت نے کوئی حکم نہیں دیا ہے۔ مجلس شوریٰ کو ان کے متعلق قانون بنانے کا اختیار ہوگا۔ مگر مجلس شوریٰ کوئی ایسا قانون بنانے کی مجاز نہ ہوگی۔ جو اسلام کے

(بقیہ فٹ نوٹ) مولانا نعیم صدیقی فرماتے ہیں "........ ماہنامہ چراغ راہ" میں دو دستوری خاکے "کا ابتدائی مسودہ شائع کیا گیا تھا .... بعد میں کراچی شہر کی جماعت اسلامی نے کسی قدر ترمیم کے ساتھ اس مسودہ کو ایک پمفلٹ کی صورت میں شائع کیا .... پھر اب اس کا دوسرا ایڈیشن بعض مزید ترمیمات اور اصلاحات کے ساتھ شائع ہو رہا ہے" "یہ مزید ترمیمات اور اصلاحات" بالعموم خوشگوار ہیں۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ قوم مسلم لیگ اور مجلس آئین ساز کے موقف کو دیکھ کر اسلامی جماعت کے بعض ارکان اپنے خیالات میں بعض تبدیلیوں پر آمادہ ہوئے ہیں۔ لیکن چونکہ یہ معلوم نہیں کہ مولانا نعیم صدیقی کو جماعت کی طرف سے تبدیلیاں کرنے کا حق حاصل ہے یا نہیں اس لئے ہم نے اپنے اقتباسات پمفلٹ کے پہلے ایڈیشن سے لئے ہیں۔ جن میں الفاظ امیرِ جماعت مولانا مودودی کے تھے۔

مجموعی نظام کی روح اور مزاج کے منافی ہو۔"

مندرجہ بالا اصولوں کا قرار داد مقاصد سے موازنہ کرنے سے اسلامی جماعت اور مسلم لیگ کے نقطۂ نظر کا اختلاف واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی اسلامی جماعت جمہور کے نمائندوں کو کم از کم اختیارات دینے کے حق میں ہے تو مسلم لیگ اور قرار داد مقاصد اس کے برعکس ہے۔ جہاں تک کتاب الٰہی کے احکام کا تعلق ہے۔ قرار داد مقاصد ان کی پابندی تسلیم کرتی ہے۔ لیکن ان احکام کی تعداد بہت مختصر ہے۔ خود مولانا مودودی نے لا کالج لاہور کے سامنے تقریر کرتے ہوئے فرمایا :-

"پائیدار اور اٹل عنصر کے ساتھ ایک دوسرا عنصر ایسا ہے جو اسلامی قانون میں بے اندازہ وسعت پیدا کرتا ہے اور اسے زمانہ کے تمام بدلتے ہوئے حالات میں ترقی پذیر بناتا ہے۔ یہ عنصر کئی اقسام پر مشتمل ہے۔

پہلا ـــــ تعبیر یا تاویل احکام۔ یعنی کوئی حکم جن الفاظ میں دیا گیا ہو ان کا مفہوم سمجھنے اور ان کا منشا متعین کرنے کی کوشش کرنا۔

دوسرا قیاس

تیسرا اجتہاد......

چوتھا استحسان"

مولانا مودودی اس وسیع ترین حصّہ کو اسلامی قانون کے ماہرین یعنی علما کی واحد ملک بنانا چاہتے ہیں۔ لیکن قرار دادِ مقاصد کے ماتحت اور مسلم لیگ کی پالیسی کے مطابق ان چیزوں میں فیصلہ قانون ساز مجلس کا ہوگا جس کے مسلمان ارکان یقیناً اس حصّہ میں بھی قوانین کے اسلامی پہلوؤں کو پیشِ نظر رکھیں گے۔ اور بوقتِ ضرورت ماہرینِ فقہ اسلامی کی رائے بھی حاصل کر سکیں گے لیکن فیصلہ ان نمائندوں کا ہوگا۔ ماہرین کا نہیں اسی اصول کے ماتحت مسلم لیگ پارٹی نے قرار دادِ مقاصد اور پھر ابتدائی دستوری سفارشات میں اسلامی جماعت کی روش کے خلاف اختیاراتِ جمہور پر کم سے کم پابندیاں لگائی ہیں۔ خدانخواستہ اس کا یہ مطلب

نہیں کہ جمہور کے فیصلے اسلام کے خلاف ہوں گے۔ بلکہ مسلم لیگ جمہور کے مسلمان نمائندوں پر اعتماد رکھتی ہے۔ کہ وہ قدرتی طور پر واضح قرآنی ارشادات کی قطعاً خلاف ورزی نہ کریں گے اور اپنے مذہب (یعنی اسلام) کے اصولوں کے مطابق قوانین بنائیں گے۔ اگر خدانخواستہ اس معاملے میں کوئی خدشہ ہے تو اس کا بہترین حل یہ ہے کہ مسلمان جماعتیں جمہور اور نمائندوں کو مختلف معاملات میں صحیح اسلامی نقطۂ نظر سے آگاہ کریں۔ نہ کہ ان سے فیصلے کا حق چھین کر ایک خاص نقطۂ نظر کے علما کی ایک جماعت کو یہ حق دے دیا جائے۔

یہی طریقہ کار مسلم لیگ نے الیکشن کے وقت اختیار کیا تھا۔ اس وقت بھی ان سے کہا جاتا تھا کہ آپ قطعی طور پر اعلان کیجئے کہ پاکستان کا آئین اس طرح کا ہوگا۔ قائداعظمؒ نے فرمایا کہ آئین کا فیصلہ تو مجلس آئین ساز کرے گی لیکن آپ مجلس کے مسلمان ارکان پر اعتماد کیجئے کہ آخر وہ مسلمان ہیں۔ اسلام کے خلاف آئین نہیں بنائیں گے اسی طرح پرانے قوانین میں غیر اسلامی عنصر کا تعلق ہے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ ایک عام اعلان یا قانون کے ذریعے سے اس عنصر کو بے اثر قرار دیا جائے لیکن جن لوگوں کو قانون کا کچھ تجربہ ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ اس طرح اس امر کا انحصار کہ کسی قانون میں کوئی چیز غیر اسلامی ہے مختلف عدالتوں کے جداگانہ فیصلوں پر ہوگا جن کے اختلافات سے ملک میں انتشار پھیلے گا۔ اس لئے بہترین طریقہ یہ ہے کہ ایک کمیشن کے ذریعے سے جس میں قدیم علما کے بھی ترجمان ہوں متعلقہ قوانین پر غور کر لیا جائے۔ اور اگر کسی قانون میں ترمیم یا تنسیخ کی ضرورت ہو تو اس مقصد کے لئے مناسب بل مجلس قانون ساز میں پیش کیا جائے۔ اس طریق کار میں دیر تو لگے گی لیکن مسلم لیگ کی عام پالیسی یہی ہے کہ ملکی نظام میں تبدیلیاں ہوں تو غور و خوض کے بعد اور ملک کا قانونی اور آئینی نظام برہم کئے بغیر اور قومی مصلحت و خیر اندیشی کا بھی یہی تقاضہ ہے۔

اسلامی قانون کو انسانی تمدن کی روز افزوں ضروریات اور تغیر پذیر حالات کے لئے موزوں بنانے کی خاطر مولانا مودودی نے جو وسائل لاء کالج کی مذکورہ بالا تقریر میں گنائے تھے۔ ان میں "اجماع" کا ذکر کہیں نہیں آیا۔ شاید اس کا باعث کسی خاص عقیدہ کا اثر ہے۔ (۱) یا وہ عام شک و شبہ جو مولانا کو

اصولی طور پر جمہور کے بارے میں ہے۔ وجہ خواہ کچھ ہو لیکن مذکورہ بالا تقریر میں "اجماع" کو قانون سازی کے ذرائع سے بالکل خارج کر کے مولانا نے اس اختلاف کو نمایاں کیا ہے جو اہل سنت والجماعت کو حضرات اہل حدیث سے ہے اور مسلم لیگ کو اسلامی جماعت سے۔ اس سلسلہ میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے جنہوں نے پاکستان کا تخیل پہلی مرتبہ قوم کے سامنے پیش کیا[1]۔ تدوین فقہ میں اجماع کو بڑی اہمیت دی ہے۔ بلکہ قرآن کریم کے بعد اسے اسلامی قانون سازی کا سب سے اہم ذریعہ بتایا ہے۔

علامہ اقبالؒ نے اس موضوع پر اپنی انگریزی کتاب SIX LECTURES ON RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM. میں جو کچھ فرمایا ہے اسے ہم یہاں نقل نہیں کرتے۔ جسے اس موضوع سے دلچسپی ہے وہ اس کتاب کا سہارا

---

[1] حکیم الامتؒ نے (خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے) نہ صرف پاکستان کا تخیل قوم کے سامنے رکھا۔ اور نئی نسل میں (جس نے معرکہ پاکستان کا اصل بوجھ اٹھایا ہے) اسلام کے لئے ایک تڑپ پیدا کر دی۔ بلکہ انہوں نے صحیح اسلامی حکومت کے تصور سے قوم کو آشنا کیا۔ اور (مولانا مودودی سے بہت پہلے) جاوید نامہ میں "حکومت الٰہیہ" کے محاسن بیان کئے۔ حال میں پنجاب کے دو نوجوان لیڈروں نے (جو تحریک پاکستان سے اس وقت سے وابستہ تھے جب مسلم لیگ نے ابھی پاکستان کو اپنا مقصد عظیم قرار نہیں دیا تھا) ایک بیان میں کہا کہ حکیم الامتؒ کا مقصد مسلمانوں کی آزاد اور خود مختار مملکت کے ذریعے سے یہ تھا کہ اس مملکت کے ذریعے اس عالم کی تشکیل ہو سکے۔ جس کے محکمات انہوں نے تفصیلاً جاوید نامہ کے اندر ارشاد فرمائے ہیں۔" (نوائے وقت ۳۱ جنوری ۱۹۵۱ء) یہ محکمات حسب ذیل ہیں :- ۱۔ خلافت آدم - ۲ حکومت الٰہی - ۳ ارض ملک خدا ست ۴ حکمت خیر کثیر است جاوید نامہ میں حکیم الامتؒ نے جو اصول بیان کئے ہیں ان کے علاوہ اسلامی نظام مملکت کے متعلق مفید ترین تفاصیل رموز بیخودی اور تشکیل اسلامیات (انگریزی) میں ملیں گی۔ [2] فقہی احادیث کے متعلق حکیم الامتؒ نے امام ابو حنیفہؒ کے نقطۂ نظر کی جس طرح وضاحت کی ہے وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے

متعلقہ باب جو برسوں کے غور و فکر کا نتیجہ ہے۔ بغور پڑھ دیکھیے لیکن ہم مختصراً یہ کہنا چاہتے ہیں۔ کہ علامہ نے اجماع کو قانون سازی میں جو اہمیت دی ہے وہ مسلم لیگ کی پالیسی اور قرارداد مقاصد کے عین مطابق ہے۔ بلکہ یہ نظر آرہا ہے کہ انشاءاللہ پاکستان کا اسلامی نظام انہی بنیادوں پر قائم ہوگا جن کا خاکہ قرآن کریم پر برسوں غور و فکر کے بعد حکیم الامت ؒ نے اپنی مختلف تصانیف میں پیش کیا ہے۔

ہمہ گیر سٹیٹ

جمہور کے متعلق مولانا مودودی کا جو نقطۂ نظر ہے اس کا تقاضہ تھا کہ ان کی "اسلامی حکومت" ایک ہمہ گیر (TOTALITARIAN) قسم کی حکومت ہو۔ وہ خود اس مسئلے پر "اسلام کا نظریہ سیاسی" میں فرماتے ہیں:۔

"اس نوعیت کا اسٹیٹ ظاہر ہے کہ اپنے عمل کے دائرے کو محدود نہیں کر سکتا یہ ہمہ گیر اور کلی اسٹیٹ ہے۔ اس کا دائرہ عمل پوری انسانی زندگی پر محیط ہے۔ یہ تمدن کے ہر شعبے کو اپنے مخصوص اخلاقی نظریہ اور اصلاحی پروگرام کے متعلق ڈھالنا چاہتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں کوئی شخص اپنے کسی معاملہ کو پرائیویٹ اور شخصی (PERSONAL) نہیں کہہ سکتا۔ اس لحاظ سے یہ اسٹیٹ فاشستی اور اشتراکی حکومتوں سے یک گونہ مماثلت رکھتا ہے[1]۔"

کیا اِسلامی حکومت میں جماعت اسلامی سے باہر رہنے والے مسلمان ذمی ہوں گے؟

مولانا مودودی کی "اسلامی حکومت" میں اُن مسلمانوں سے جو "اسلامی جماعت" کے پوری طرح ہم خیال نہیں، کیا سلوک ہوگا۔ اس کی توضیح خود مولانا "اسلام کا نظریہ سیاسی" میں یوں فرماتے ہیں:۔

"دوسری بات جو اسلامی اسٹیٹ کے دستور اور اس کے مقصد اور اس کی اصلاحی نوعیت پر غور کرنے سے خود بخود واضح ہو جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ایسے اسٹیٹ کو صرف وہی لوگ چلا سکتے ہیں جو اس کے دستور پر ایمان رکھتے ہوں جنہوں نے اس کے مقصد کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا ہو۔ اور جو اس

---

[1] اسلام کا نظریہ سیاسی۔ ص ۳۴ - ۳۵

کے اصلاحی پروگرام سے نہ صرف پوری طرح متفق ہوں، نہ صرف اس میں کامل عقیدہ رکھتے ہوں بلکہ اس کی اسپرٹ کو اچھی طرح سمجھتے بھی ہوں۔ اور اس کی تفصیلات سے واقف بھی ہوں۔ اسلام نے اس باب میں کوئی نسلی جغرافی۔ وطنی یا لسانی قید نہیں رکھی ہے۔ وہ تمام انسانوں کے سامنے اپنے دستور، اپنے مقصد اور اپنے اصلاحی پروگرام کو پیش کرتا ہے۔ جو شخص بھی اسے قبول کرے خواہ وہ کسی نسل کسی ملک اور کسی قوم سے تعلق رکھتا ہو۔ وہ اس جماعت میں شریک ہو سکتا ہے جو اس اسٹیٹ کو چلانے کے لئے بنائی گئی ہے۔ مگر جو اسے قبول نہ کرے اسے اسٹیٹ کے کام میں دخیل نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اسٹیٹ کے حدود میں ذمی (SUBJECT) کی حیثیت سے رہ سکتا ہے اس کے لئے اسلام کے قانون میں معین حقوق اور مراعات موجود ہیں۔ اس کی جان و مال اور عزت کی پوری حفاظت کی جائیگی۔ اور اگر وہ کسی خدمت کا اہل ہو گا تو اس سے یہ خدمت بھی لی جائے گی لیکن بہر حال حکومت میں شریک کی حیثیت نہیں دی جائے گی کیوں کہ یہ ایک خاص مسلک رکھنے والی پارٹی کا اسٹیٹ ہے۔"[1]

مولویوں کی حکومت

قانون سازی بلکہ زندگی کے تمام شعبوں میں اسلامی جماعت کا مسلک یہ ہے کہ قلیل سے قلیل حصہ عوام کے نمائندوں اور زیادہ سے زیادہ حصہ علما کو تفویض ہو۔ لیکن جماعت کے لٹریچر کو پڑھیں تو اس سے بھی زیادہ دلچسپ اور اہم حقیقت یہ نظر آتی ہے کہ شاید تحریک جماعت اسلامی کے محرکات میں ہی ایک بڑا سبب مسلمانوں کے ایک طبقے یعنی علما کو برسرِ اقتدار لانا تو نہیں۔ مولانا مودودی مدت تک جمعیت العلمائے ہند سے وابستہ رہے اور اس ادارہ کے نفس ناطقہ کی حیثیت رکھتے تھے ان کی تحریروں کو دیکھیں۔ تو ان میں جا بجا اس کرب اور درد کا اظہار نظر آتا ہے۔ جو ان کے دل میں تحریک خلافت کی ناکامی کے بعد علما کے سیاسی زوال اور مسلم لیگ

---

[1] اسلام کا نظریہ سیاسی۔ ص ۳۵-۳۶۔

کے سیاسی اقتدار سے پیدا ہوتا تھا۔ "سیاسی کشمکش" حصہ اوّل کی ابتدا میں لکھتے ہیں :-

"تحریک خلافت کی ناکامی کے بعد سے کامل ۱۵ برس تک مسلمان جس انتشار فکر و عمل میں مبتلا رہے اس کو دیکھ کر دل خون ہوا جاتا تھا۔"

"سیاسی کشمکش" حصہ سوم کے آغاز میں بھی اسی رنج و کرب کا اظہار ہے۔ جو انہیں مسلم لیگ کے قومی قیادت سنبھالنے سے ہوتا تھا۔ فرماتے ہیں :-

"اس نئی تحریک کے دَور میں عامہ مسلمین کی قیادت و رہنمائی ایک ایسے گروہ کے ہاتھ میں چلی گئی جو دین کے علم سے بے بہرہ ہے۔ اور محض قوم پرستانہ جذبہ کے تحت اپنی قوم کے دنیوی مفاد کے لئے کام کر رہا ہے۔ دین کا علم رکھنے والا عنصر اس گروہ میں اتنا بھی نہیں جتنا آٹے میں نمک ہوتا ہے۔ اور اس قدر قلیل کو بھی کوئی دخل رہنمائی میں نہیں ہے . . . . . اور میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ ہندوستان میں اس سے پہلے کبھی عام مسلمانوں کا اعتماد علمائے دین سے ہٹ کر اس شدت کے ساتھ غیر دین دار اور ناواقف دین رہنماؤں پر نہیں جما تھا۔"

مولانا کی تحریروں کے علاوہ اسلامی جماعت کے دوسرے لٹریچر میں بھی گاہے گاہے انہی ارمانوں کی جھلک نظر آتی ہے۔ جماعت کے ترجمان ذہین لوگ ہیں۔ بالعموم وہ ان خیالات کو زبانی گفتگو تک محدود رکھتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی یہ خیالات صفحہ کاغذ پر بھی ابل پڑتے ہیں۔ مثلاً جماعت کے شعبہ نشر و اشاعت نے مولانا کی نظر بندی کے بارے میں جو رسالہ شائع کیا اس میں "مولوی" کے یہ ترجمان حکومت کی نسبت طنزاً لکھتے ہیں کہ ارباب اقتدار "پچھلے تجربات کی بنا پر جانتے تھے کہ مولوی اب آگے چلنے اور دنیا کو اپنے پیچھے چلانے کی طاقت کھو چکا ہے۔ اور اسے ہم سیاست کے میدان سے باہر دھکیلنے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ وہ کانگریس کی طرف گیا تو تبع بن کر اور لیگ کی طرف آیا تو بھی تبع بن کر یا پھر خاموشی کے ساتھ گوشوں میں بیٹھ کر دعا گوئی اور وعظ گوئی کرتا رہا"۔ لیکن اب ان کا مقابلہ نئی قسم کے لوگوں سے تھا؛

یہ تو خدا ہی جانتا ہے کہ یہ خیالات حکمران طبقے کے ذہن میں تھے یا نہیں۔ لیکن اسلامی جماعت کے شعبۂ نشر و اشاعت نے تو اپنے مافی الضمیر کا اظہار کرکے یہ بتا دیا کہ ان کا مقصد "مولوی" کو "آگے" چلانا اور دنیا کو اس کے پیچھے لگانا اور اس سے سیاست کے میدان میں از سرِ نو قیادت کا کام لینا ہے۔

بعض اوقات تو اسلامی جماعت کا یہ مطمع نظر ان کے ترجمانوں کے ذہن پہ اس طرح مستولی ہو جاتا ہے کہ اگر حکومت اسلام کی خدمت کے لئے کوئی قدم اٹھاتی ہے تو وہ اس کی اس بنا پر مخالفت کرتے ہیں کہ ان کا اصل منصوبہ یعنی دین و دنیا پر علما کا کامل اقتدار نظر سے اوجھل نہ ہو جائے۔ مثلاً اپریل ۱۹۴۸ء میں حکومت پنجاب نے ایک اسلامی اکیڈیمی کے قیام کے لئے دو لاکھ کی رقم بجٹ میں رکھی اس پر جماعت اسلامی کا ترجمان "کوثر" لکھتا ہے :-

چند کلیوں پر قناعت

"خلافت پاکستان گروپ پنجاب اسمبلی کے میدان جنگ میں ایک مورچہ فتح کرکے بہت مسرور ہے۔ یعنی حکومت نے ان کا مطالبہ مان لیا ہے کہ ایک اسلامی اکیڈیمی قائم کی جائے گی جو خطیب۔ مولوی۔ امام۔ مُلّا۔ مفتی اور مدرس وغیرہ ڈھالنے کا کارخانہ ہو گی۔ اس کے لئے دو لاکھ روپے کا گراں بہا صرف بھی بجٹ میں مخصوص کر دیا گیا ہے۔

اسلامی نظام۔ اسلامی حکومت۔ اسلامی قانون کا مطالبہ کرنے والے یہ لوگ اپنے مطالبہ کی وسعتوں سے خود ناواقف ہیں اور ناواقفیت کی وجہ سے انہوں نے گلشن میں "تنگی داماں" کا علاج تلاش کرنے کے بجائے "چند کلیوں"[1] پر قناعت کر لی۔

---

[1] اقبال کا شعر ہے

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے

اسلامی اکیڈیمی درحقیقت حکومت کی فتح ہے ۔ اور خلافت پاکستان گروپ کی شکست ہے۔ کیوں کہ اس اکیڈیمی کے قیام سے دین وسیاست کی تفریق کرنے والی دیوار کا بنیادی ردہ رکھ دیا گیا ہے۔ اور اس ردہ کے رکھنے میں خود وہ لوگ شریک ہیں جو دین کو سیاست پر غالب کرنے کے عزائم ظاہر کرتے ہیں حکومت اگر ان کی مدد سے اس دیوار کو کچھ اور اونچا کرنے میں کامیاب ہو گئی تو پھر اسلامی نظام کے خطرے سے اس کے تمام ارباب کار محفوظ ہو جائیں گے اور آرام کی نیند سو سکیں گے۔

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت

اسلامی نظام کا مطالبہ کرنے کے لئے وہ وسعت نظر چاہیے جو پورے گلشن کو احاطے میں لے لے۔ یہ مہم ان لوگوں کے ذریعے سر ہونے کی نہیں جو ایک طرف پورا گلشن مانگتے ہوں اور دوسری طرف چند کلیاں ملتی دیکھ کر بھی دامن پھیلا دیں کہ کہیں ان سے بھی ہاتھ نہ دھونے پڑیں"۔

اصولی طور پر جماعت اسلامی کے اس خیال میں کوئی قباحت نہیں کہ قوم کی دینی اور دنیوی قیادت علما کے ہاتھ میں ہو۔ قوم کا فائدہ اسی میں ہے کہ جو افراد یا طبقہ اس کی قیادت کے لئے سب سے موزوں ہے وہی برسر اقتدار آئے۔ لیکن عام طور پر اس اصول کا مفہوم یہی لیا جاتا ہے کہ جو افراد یا گروہ جس چیز کی خاص طور سے صلاحیت رکھتا ہو اور جس راہ کے پیچ وخم سے خوب واقف ہو اسی میں اس کو رہنما بنانا چاہیئے۔ اب یہ کام مختلف جماعتوں اور طبقوں کا ہے کہ وہ اپنی اپنی صلاحیتیں قوم پر واضح کریں۔ لیکن قوم کو جو تھوڑا بہت تجربہ سیاسی اور دنیوی امور میں علما کی راہنمائی کا ہے وہ چنداں امید افزا نہیں ہندوستان میں تو مسلمانوں کی حکومت کے دوران میں علما نے کبھی خواہش نہیں کی کہ دنیوی حکومت کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں ہو۔ البتہ الہلال کی دعوت کے بعد ایک خاص ڈھب کے علما نے ضرور سیاست میں دخل دینا شروع کیا لیکن قومی زندگی کے ایک اہم مرحلے پر علمائے اسلامی ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں

جو پارٹ ادا کیا وہ اس درجہ عبرت آموز ہے کہ تعجب آتا ہے کہ اس کو دیکھتے ہوئے بھی کسی کو اس تمنا کی جرأت کیسے ہوئی کہ سیاسی اور دنیوی امور کی زمام قیادت علما کو سونپ دی جائے۔

ترکی کے عسکری اور ملی زوال میں علما کا حصہ دوسرے اسلامی ممالک میں علمانے اس میدان میں جو کارنامے سرانجام دئے ہیں۔ان کی تفصیل کے لئے مجلدات چاہیئیں۔ہم مشتے نمونہ از خروارے مولانا مودودی کے قلم سے لکھے ہوئے علما کے ان کارناموں کی روئداد درج کرتے ہیں۔جو انہوں نے انیسویں صدی میں ترکی کی جدید عسکری تنظیم کی مخالفت میں انجام دیئے۔اور جن کا ترکی کے ملی زوال، اور علما کے خلاف ترکوں میں جذباتِ تنفر پیدا کرنے میں بڑا دخل تھا۔ مولٰنا مودودی اٹھارویں صدی میں ترکی کی کمزوری کا ذکر کر کے لکھتے ہیں:۔

"انیسویں صدی کے آغاز میں سلطان سلیم نے اس کمزوری کو محسوس کیا اور انتظام سلطنت کی اصلاح۔ علوم جدیدہ کی اشاعت۔طرز جدید پر عسکری تنظیم۔اور جدید مغربی آلات حرب کی ترویج شروع کی لیکن جاہل صوفیوں اور تنگ نظر علمانے جو دین کے علم اور اس کی روح سے قطعاً بے بہرہ تھے۔مذہب کے نام پر اصلاحات کی مخالفت کی۔یورپین طرز پر فوج کی تنظیم کو بے دینی سے تعبیر کیا۔ جدید فوجی وردیوں کو تشبہ بالنصاریٰ قرار دیا۔سنگین تک کے استعمال کی اس لئے مخالفت کی گئی کہ کافروں کے اسلحہ استعمال کرنا ان کے نزدیک گناہ تھا۔سلیم کے خلاف یہ کہہ کر نفرت پھیلائی گئی کہ وہ کفار کے طریقے رائج کر کے اسلام کو خراب کر رہا ہے۔شیخ الاسلام عطاءاللہ آفندی نے فتویٰ دیا کہ ایسا بادشاہ جو "قرآن کے خلاف" عمل کرتا ہو بادشاہی کے لائق نہیں۔آخر کار ۱۸۰۷ء میں سلیم کو معزول کر دیا گیا یہ پہلا موقع تھا کہ مذہبی پیشواؤں نے اپنی جہالت اور تاریک خیالی سے اسلام کے مانع ترقی ہونے کا تخیل پیدا کیا۔

زمانے کے حالات تیزی کے ساتھ بدل رہے تھے۔دوسرے مسلمانوں کی بہ نسبت ترکوں پر ان

تغیرات کا زیادہ تر اثر پڑ رہا تھا۔ وہ یورپ کے مقابلہ میں بالکل سینہ بسینہ کھڑے تھے اور برسرِ پیکار تھے۔ مغربی قوموں کے ساتھ ان کے سیاسی۔ تمدنی اور تجارتی تعلقات نہایت گہرے تھے اور خود ان کی ماتحت یورپین اور عیسائی قومیں سرعت کے ساتھ مغرب کے اثرات قبول کر رہی تھیں مگر ترکوں کے مذہبی پیشواؤں نے جو تفقہ اور اجتہاد سے بالکل عاری اور اسلام کی حقیقی تعلیمات سے قطعاً ناواقف تھے۔ ان تغیرات کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں اور ترکی قوم کو مجبور کیا کہ سات سو برس پہلے کی فضا سے ایک قدم آگے نہ بڑھے۔ سلیم کے بعد محمود نے اصلاح کی کوششیں کیں اور علما و مشائخ نے پھر مخالفت کی۔ بڑی مشکلات کا مقابلہ کرنے کے بعد ۱۸۲۶ء میں محمود اس قابل ہو سکا کہ جدید عسکری تنظیم کو رائج کر سکے۔ مگر علما اور درویش برابر یہی تبلیغ کرتے رہے کہ یہ اصلاحات بدعت ہیں۔ ان سے اسلام کو خراب کیا جا رہا ہے۔ سلطان بے دین ہو گیا ہے۔ اور طرز جدید کی فوج میں بھرتی ہونا مسلمانوں کے لئے خرابی ایمان کا موجب ہے۔"[1]

دنیوی امور میں زمام قیادت علما کے ہاتھ میں دینے سے دنیوی معاملات میں جو نقصانات ہوں گے وہ ظاہر ہیں۔ لیکن ہماری ذاتی رائے تو یہ ہے کہ علما مذہب کو چھوڑ کر دوسرے میدانوں میں سرگرم کار ہوئے تو مذہب اور خود علما کو بھی نقصان پہنچے گا۔ اس برعظیم میں صدیوں تک مسلمانوں کی حکومت رہی لیکن "تقسیم کار" کا اصول زیر عمل تھا۔ اور کسی وقت کسی عالم۔ کسی فقیہ۔ کسی ولی اللہ نے اس بات کی خواہش نہیں کی کہ دنیوی معاملات کی باگ میرے ہاتھ میں دے دی جائے۔ بلاشبہ اسلامی حکومت میں علما اور فقہا کا بڑا درجہ تھا۔ شرع ریاست کا قانون تھا۔ اور جس طرح آج کل کے مجسٹریٹ اور منصف فوجداری اور دیوانی مقدمات فیصل کرتے ہیں۔ اسی طرح بعض قسم کے مقدمات اور مسائل قاضیوں اور مفتیوں کے پاس جاتے تھے۔ اور بعض کا فیصلہ بادشاہ اور حکام کرتے تھے۔ علما اور صلحا کا اس زمانہ میں بڑا احترام

---

[1] ملاحظہ ہو تنقیحات از مولانا مودودی ص ۷۷-۵۸

ہوتا تھا۔ لیکن انھوں نے کبھی سیاسی اقتدار کی خواہش نہیں کی۔ بلکہ وہ سمجھتے تھے کہ تقسیم کار کا اصول قوم کی بنیادی ضروریات پورا کرنے کا بہترین طریقہ ہے۔ مثلاً امام الہند شاہ ولی اللہ محدثؒ نے جو بلا کسی شک وشبہ کے اس برِاعظم کے سب سے بڑے مذہبی عالم گزرے ہیں۔ دین و دنیا کی قیادت میں ایک حد فاصل قرار دی اور ایک کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی "خلافت ظاہری" اور دوسری کو "خلافت باطنی" کا عنوان دیا۔ چنانچہ "فیوض الحرمین" میں فرماتے ہیں:۔

"رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی زندگی میں امت مرحومہ کے لئے نیک نمونہ ہے، مثلاً "خلافت ظاہری" والوں کے لئے جو شرعی حدود اور جہاد کے ساز و سامان کی تیاری اور سرحدی علاقوں کی ناکہ بندی وحفاظت اور وفود کو اکرام وانعام دینے کی خدمت اور صدقات محصول۔ مالگذاری وغیرہ کی وصولی۔ ارباب استحقاق پر ان کی تقسیم۔ مقدمات کے فیصلوں۔ یتیموں کی نگرانی۔ مسلمانوں کے اوقاف کا انتظام۔ راستوں۔ سڑکوں اور مساجد وغیرہ کی تعمیر اور اسی قسم کے اور کاموں کے لئے مقرر ہیں مسلمانوں میں جو ان خدمات اور مشاغل میں مصروف ہیں۔ ان کو میں خلافت ظاہری کے نام سے موسوم کرتا ہوں۔

جو لوگ "باطنی خلافت" والے ہیں۔ یعنی جو اس کام پر مقرر ہیں کہ شرائع اور قوانین اسلامی قرآن اور سُنن وآثار کی تعلیم دیں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کریں۔ وہ لوگ جن کے کلام سے دین کی تائید ہوتی ہے۔ خواہ وہ مناظرہ ومباحثہ کی راہ سے، جیسا کہ متکلمین اسلام کا حال ہے۔ یا وعظ وپند کے طریقے سے جیسا کہ اسلام کے مقررین اور خطبا جس خدمت کو انجام دیتے ہیں۔ یا وہ لوگ جو اپنی صحبت اور توجہ وہمت سے اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کرتے ہیں۔ جیسا کہ مشائخ وصوفیا کا حال ہے۔ اسی طرح جو نمازیں قائم کراتے ہیں۔ حج کراتے ہیں اور جو احسان (دوام حضور) کے حصول کی راہ لوگوں کو بتاتے ہیں۔ اور زہد وتقوے کی طرف لوگوں کو راغب کرتے ہیں۔ ان لوگوں کو ہم خلفائے باطنی کے نام سے

موسوم کرتے ہیں"۔ (ترجمہ)

اسی طرح اسلام کے سب سے بڑے مورخ علامہ ابن خلدونؒ کا جسے امور دنیوی کا بھی کامیاب تجربہ تھا، قول ہے :-

"اَلْعُلَمَاءُ اَبْعَدُ النَّاسِ عَنِ السِّیَاسَةِ" یعنی امور سیاست سے کوئی طبقہ اس درجہ بیگانہ نہیں ہوتا جس درجہ ہمارے علما :

مذہب اور سیاست کے توام ہونے کا نظریہ سب سے پہلے مولانا ابوالکلام آزاد نے پیش کیا۔ الہلال کے ایک ہاتھ میں سیاست تھی تو دوسرے میں مذہب۔ اس کا دعوےٰ تھا کہ وہ ان دونوں معاملات میں قرآن کریم کی پیروی کرتا ہے۔ بالآخر سیاست میں قرآن کریم کی نام نہاد پیروی مولانا ابوالکلام آزاد کو جس راستہ پر لے گئی وہ سب کو معلوم ہے۔ لیکن فی الحقیقت سیاست اور مذہب کی وحدت کا نظریہ ان علما نے پیش کیا جو جرنلسٹ اور دنیا دار پہلے تھے اور دینی راہنما بعد میں ہوئے (خواہ کسی مصلحت کی خاطر[1] یا کسی ذہنی انقلاب سے متاثر ہو کر) مثلاً پروفیسر شبلی[2]۔ ابوالکلام آزاد اور مولانا مودودی۔ ہمارے قدیم رہنماؤں کا طرز عمل اس بات میں یہ تھا کہ اگر کسی وقت (مثلاً سکھوں کی حکومت میں) ملکی معاملات میں دخل دینا فریضہ دین ہو جاتا تو وہ اس سے ہرگز نہ ہچکچاتے لیکن عام طور پر انہوں نے ملکی معاملات دوسروں پر چھوڑے۔ اور اپنے تئیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خلافت باطنی کے لئے وقف رکھا۔

اب بھی ہمارے بہت سے متقی اور صالح علما کی یہی روش ہے۔ لیکن بعض حضرات ہیں جو جرنلسٹ

---

[1] و [2] سید سلیمان ندوی حیات شبلی میں لکھتے ہیں کہ یہ شبلی کا فیض تھا جس نے ابوالکلام آزاد کو مولوی ابوالکلام آزاد بنا دیا"۔ شبلی بھی مولانا ابوالکلام آزاد کو ایک خط میں لکھتے ہیں: "اب آپ کو مولویت کی صورت میں زیادہ رہنا چاہیئے۔ اس سے اچھے اچھے کام لے سکتے ہیں"۔ مکاتیب شبلی (اشاعت ثانی)

بھی ہیں اور علما بھی۔ ان کا طریق کار اس سے مختلف ہے۔ ہمیں ڈر ہے کہ اس نئے طریق کار سے ایک تو مسلمانوں کی روحانی اور اخلاقی حالت کو ضعف پہنچے گا کیوں کہ جس جماعت کا فرض اس حالت کی اصلاح ہے وہ اس فرض کی ادائیگی کو چھوڑ کر دنیوی اور ملکی معاملات کے پیچھے پڑ گئی ہے۔ دوسرے ملکی سیاست ایک ایسا کھیل ہے کہ علما کے میدان سیاست میں اتر آنے سے ان پر بھی چھینٹیں پڑیں گی۔ اور ممکن ہے کہ اس سے مذہب اور ارباب مذہب کے وقار کو ٹھیس لگے۔

جدید تعلیم اور تعلیم یافتہ طبقہ کی مخالفت

اسلامی جماعت کا دعویٰ ہے کہ ان کا طریق کار قوم کو اس طبقاتی جنگ سے بچائے گا جو اشتراکیت پسند لوگ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ ممکن ہے یہ دعویٰ صحیح ہو۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ خود اسلامی جماعت نے ایک دوسری قسم کی شدید طبقاتی جنگ قوم کے جدید و قدیم طبقوں میں پیدا کر دی ہے۔ مولانا مودودی تسلیم کرتے ہیں کہ مخالفانہ اور نقادانہ نقطہ نظر کو سوچنے اور سمجھنے کی جس قدر صلاحیت جدید طریقہ میں ہے تعلیم میں نہیں[1]۔ نیز ان کی جماعت کو جدید گروہ سے طرح طرح کی جو مدد ملی ہے۔ اسے بھی وہ خوب جانتے ہیں۔ لیکن کچھ تو اس لئے کہ اب ان کے گرد قدیم کے پرستار اور جدید کے غالی مخالف زیادہ جمع ہیں، اور دوسرے اس لئے کہ جماعت قدیم کے ترجمانوں کو برسرِ کار لانے میں ساعی ہے۔ ان کی تحریر و تقریر میں طبقہ جدید کے حق میں سخت تلخ گوئی سے کام لیا جاتا ہے۔ مثلاً موجودہ سیاسی کشمکش کے حصہ اوّل میں انہوں نے مغربی تعلیم یافتہ طبقہ کے متعلق مولانا ابوالکلام آزاد کے جو پرانے خیالات زیادہ زوردار الفاظ میں دہرائے وہ کس درجہ تلخ اور یک طرفہ تھے کہ خود مولانا کے بعض عقیدتمندوں نے بھی اختلاف کیا۔ اور اس بات کو غلط ثابت کیا کہ گذشتہ ستر سال میں مغربی تعلیم سے مسلمانوں کو نقصان ہی نقصان پہنچا ہے۔" لیکن مولانا سے بھی زیادہ

---

[1] ملاحظہ ہو خطبہ تقسیم اسناد" میں مولانا مودودی کا پیش لفظ۔

مضر نقطۂ نظر جماعت کے دوسرے ارکان کا ہے جو اخبارات ورسائل میں مغربی تعلیم کا استہزا کار ثواب سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک جدید طرز کا اسکول ایک "قتل گاہ"[1] ہے جہاں اسلام عقل اور ایمان کا قتل ہوتا ہے اور قوم کی سب برائیوں کا باعث اس طریق تعلیم کو قرار دیا جاتا ہے۔ اس موضوع پر جماعت کے نقطۂ نظر کا واضح ترین اظہار مولانا نسیم صدیقی ایڈیٹر جہان نو کے ایک ڈرامہ میں ہوتا ہے۔ جس کا عنوان ہے۔ "میرا نام ہے تعلیم"۔ اس کے مطالعہ کے بعد ہمارے موقف اور جماعت اسلامی کے نقطۂ نظر کی وضاحت ہو جاتی ہے

اس ڈرامے میں ظاہر کیا گیا ہے کہ جدید تعلیم صداقت۔ عدل نیکی۔ خدا پرستی سے انسان کو محروم کر دیتی ہے۔ سائنس کے علم سے انسان مادیات میں اس قدر الجھ جاتا ہے۔ کہ روح کے مطالبات کو سننا بھی گوارا نہیں کرتا۔ فلسفہ کی تعلیم انسانوں کو قیاسات و ظنیات کا غلام بنا دیتی ہے۔ علوم خواہشات نفس کے تابع ہو جاتے ہیں۔ نوجوانوں کا مشغلہ محض بحث و تمحیص رہ جاتا ہے۔ ادب کا جادو گویا زہر کو کھانڈ میں لپیٹ کر پیش کرتا ہے۔ کیوں کہ جو نظریات اور دعوے ادب کے لباس میں سامنے آتے ہیں وہ بلا چون و چرا تسلیم کر لئے جاتے ہیں۔ تعلیم ذوق جمال کو بگاڑ کر خواہش پرستی میں لگا دیتی ہے۔ اور وہ مناظر فطرت۔ صنفیات۔ حیوانی خواہشات اور موسیقی۔ شاعری۔ مصوری اور بت تراشی کے گرد طواف کرنے لگتا ہے چنانچہ جسم کی طرف پوری توجہ کے باعث سیرت۔ اخلاق اور اعمال نذر تغافل ہو جاتے ہیں۔ غرض اس ڈرامے میں شروع سے آخر تک تعلیم کو گمراہی کا باعث بتایا گیا ہے۔

جدید تعلیم کے فوائد اور نقائص پر بحث کرنے کی یہاں گنجائش نہیں۔ ظاہر ہے کہ جو طبقہ اعلیٰ تعلیم پا کر اپنے آپ کو سرکاری ملازمت کے لئے وقف کر دے قوم کے لئے اس کے مفید ہونے کی صلاحیت یقیناً کم ہو جائے گی لیکن جدید طریقہ تعلیم کو مضر کہنے والے حضرات ذرا سعودی عربستان اور افغانستان میں قدیم طریق تعلیم کے نتائج بھی دیکھ لیں۔ اور انصاف سے بتائیں کہ مسلمانوں کا نقصان کہاں زیادہ ہو رہا ہے؛

---

[1] جہان نو۔ یکم دسمبر ۱۹۴۹ء

جدید طرز تعلیم اور تعلیم یافتہ طبقہ میں خامیاں ہیں اور ان میں اصلاح کی ضرورت بھی ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اگر (متعدد دوسری ہستیوں سے قطع نظر) جدید تعلیم فقط حکیم الامت علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ ہی پیدا کرتی۔ تب بھی انصاف کا تقاضا تھا کہ جدید تعلیم کے خلاف زبان کھولنے میں تامل سے کام لیا جائے۔

مغربی تعلیم اور اسے حاصل کرنے والوں کے متعلق جماعت کا جو نقطۂ نظر ہے، اس سے نہ صرف ایک وسیع قسم کی طبقاتی کشمکش پیدا ہوتی ہے۔ بلکہ اس سے جدید قسم کی تعلیم جس پر قوم کی مادی ترقیوں کا انحصار ہے اثر پڑے گا۔ حالانکہ خود مولانا مودودی ایک زمانہ میں فرما چکے ہیں کہ "مغربی علوم و فنون بجائے خود سب مفید ہیں اور اسلام کو ان میں سے کسی کے ساتھ دشمنی نہیں۔ بلکہ ایجاباً میں یہ کہوں گا کہ جہاں تک حقائق علمیہ کا تعلق ہے اسلام ان کا دوست ہے۔ اور وہ اسلام کے دوست ہیں"۔ لیکن عام طور پر اسلامی جماعت کا موجودہ نقطۂ نظر ان علوم و فنون کے متعلق مولانا مودودی کے اس قدیم ارشاد کے برعکس ہے۔

اس کے علاوہ جماعت کا اس بات پر بھی بڑا زور ہے کہ اسلام کا نقطۂ نظر ہر بات میں باقی سب دنیا (بالخصوص مغرب) سے بالکل مختلف ہے۔ مسلمانوں کی قومی خودپسندی کی اس بات سے تسکین تو ہو جاتی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ زاویۂ نگاہ واقعات کے اور اسلام کے اس بنیادی نظریے کے بھی خلاف ہے کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے خدا نے دوسری قوموں میں بھی انبیائے برحق بھیجے۔ ظاہر ہے کہ ان کی تعلیمات پوری طرح نہیں تو کم از کم ان کا کچھ حصہ ان قوموں میں بھی باقی رہ گیا ہوگا۔ پھر ویسے بھی انصاف سے دیکھئے کہ نیکیوں کی تعریف۔ جھوٹ۔ چوری۔ زنا۔ قتل کی مذمت وغیرہ دوسرے مذاہب اور دوسری اقوام میں بھی ہے اور اہل کتاب میں ان خوبیوں کا ہونا تو اسلامی عقائد کی رو سے بھی لابد معلوم ہوتا ہے۔ نیز بہت سی خوبیاں ایسی ہیں کہ کسی ایک مذہب تک محدود نہیں۔ بلکہ تمام مذاہب کا مطمع نظر ہیں۔ اور انٹرنیشنل یا بین الملی حیثیت رکھتی ہیں۔ اسی طرح انسانی ضروریات اور مسائل اور ان کے حل کرنے کے بھی کئی طریقے ایسے ہیں جو ایک قوم کے

پہلے اختیار کر لینے سے اس قوم کے لئے مخصوص نہیں ہو جاتے۔ اور دوسروں کو ان کے متعلق "خذ ما صفا و دع ما کدر" کا اصول اختیار کر لینے میں کوئی قباحت نہیں ہوتی۔ مگر اسلامی جماعت کی مسلسل کوشش یہ ہے کہ جس قدر اور جس طرح ہو سکے قوم کا زاویہ نگاہ محدود ہی رہے۔ خواہ اس سے قومی مصلحتوں کا خون ہی کیوں نہ ہو۔ اور اس مقصد کے لئے اسے غیر اسلامی طرز استدلال ہی کیوں نہ اختیار کرنا پڑے۔

دُنیوی ترقی کی مخالفت

انتہا پسندانہ نقطۂ نظر، جمہور کے حقوق کی مخالفت، جدید تعلیم کے استہزا اور سیاسیات میں علما کو سرگرم کار رکھنے سے جو الجھنیں پیدا ہوں گی شاید قوم کے لئے ان سے بھی زیادہ خطرناک وہ روش ہے۔ جو اسلامی جماعت نے مسلمانوں کے دنیوی مفاد اور مادی ترقی کے متعلق اختیار کر رکھی ہے۔

مادی اعتبار سے مسلمانوں کی جو حالت اس وقت دنیا میں ہے اور اس سے ان کی سیاسی اور قومی زندگی بلکہ کیر کٹر اور مسلمان عوام کی بود و باش اور معیار زندگی پر جو اثر پڑتا ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ تمام اہل الرائے اس پر متفق ہیں کہ مسلمانوں کی مادی پستی کو دور کرنے اور دنیوی حیثیت سے انہیں سربلند کرنے کی ضرورت ہے لیکن جماعت اسلامی کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ بلکہ بار بار ان ارادوں پر طنز کیا جاتا ہے۔ ان کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ گویا کہ یہ ارادے کوئی گناہ یا قابل ملامت چیز ہیں!

مفادِ ملی کا استہزا مولانا صدر الدین اصلاحی جماعت اسلامی کے ایک سربر آوردہ رکن ہیں۔ ان کا ایک طویل مقالہ فریضہ اقامت دین، پہلے ترجمان القرآن میں چھپا۔ اب کتابی صورت میں بھی ملتا ہے۔ اس میں وہ فرماتے ہیں:۔

مفادِ ملّی کا بُت

اس سلسلہ میں۔ یعنی اقامت دین کے سلسلہ میں ہمارے لئے سب سے زیادہ حیران کن جو شے

ہے وہ "مفاد ملت"، کے نقصانات کا ذکر ہے ہم اس نظریے کے واضعین اور حامیین سے اس کے سوائے کچھ نہیں کہنا چاہتے کہ :-

"کوئی آدمی دو مالکوں کی خدمت نہیں کر سکتا۔ تم خدا اور دولت۔ دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے"

(حضرت مسیحؑ)

اس نظریہ کے ساتھ خدا پرستی کا جوڑ کبھی نہیں لگ سکتا۔ جس مفاد قومی کا آپ شور مچا رہے ہیں وہ ایک خطرناک بت ہے۔ جس کو توڑے بغیر اسلام کا مفاد پورا نہیں کیا جا سکتا"!

اسلام اور ملی مفاد کے تضاد پر جو زور مولانا صدر الدین اصلاحی نے دیا ہے ٹھیک اسی قسم کا اظہار خیال امیر جماعت مولانا مودودی نے اسلام اور اسلامی قومیت کے تقاضوں کے متعلق کیا تھا۔ جب وہ ۱۹۴۷ء میں مدراس تشریف لے گئے تو (جیسا کہ اس سے پہلے ذکر آ چکا ہے) لیگ کے ایک سرکردہ لیڈر ڈاکٹر نعمت اللہ نے ایک چٹ بھیج کر ان سے ایک جلسہ عام میں یہ سوال کیا کہ :-

"کیا اسلام اور مسلمانوں کی خدمت ایک وقت میں نہیں کی جا سکتی۔ اگر نہیں تو کیوں"!

سوال بالکل صاف تھا۔ اور شاید ارکان جماعت کو چھوڑ کر اور کوئی اس کا جواب (اثبات میں) دینے میں ایک لمحہ تاخیر نہ کرتا۔ لیکن چونکہ جماعت اس بنیادی مسئلہ پر ایک خاص نقطۂ نظر رکھتی ہے اس لئے مولانا نے فوری جواب دینے سے گریز کیا اور اعلان فرمایا کہ بعد کے جلسہ میں اس سوال کا جواب دیا جائے گا۔ بدقسمتی سے نہ جلسہ ہوا نہ جواب دینے کا فریضہ ادا ہوا۔ لیکن ایک دوسرے موقع پر مولانا مودودی نے اسلام اور اسلامی قومیت کے تقاضوں کی نسبت جو دو ٹوک رائے ظاہر فرمائی۔ وہ فی الحقیقت اس سوال کا جواب تھی۔ فرماتے ہیں :-

"اسلام کی لڑائی اور قومی لڑائی ایک

ساتھ نہیں لڑی جا سکتی"۔

ظاہر ہے کہ جو جماعت ملی مفاد کو ایک "بت" سمجھے اور اسلام اور مسلم قومیت کے تقاضوں میں بنیادی تضاد محسوس کرے اس سے کس طرح یہ توقع ہو سکتی ہے کہ وہ مسلمانوں کی قومی ضروریات کا انتظام تو ایک طرف، احساس ہی کر سکے گی۔ چنانچہ تحریک پاکستان کے موقع پر یہی ہوا کہ مولانا مودودی نے اپنی جماعت کے ان لوگوں کو بھی جو پاکستان میں شامل ہونے والے علاقوں میں رہتے تھے پاکستان کی تحریک سے علیحدہ رہنے کی ہدایت فرمائی۔ اور مسلمانوں کو پاکستان سے برگشتہ کرنے کے لئے ایسی باتیں لکھیں کہ ان سے زیادہ سخت چیزیں کانگریسی لٹریچر میں بھی نہیں ملیں گی۔

عملی نتائج قوم کی بنیادی ضرورت کو نظر انداز کرنے بلکہ محسوس نہ کرنے سے اسلامی جماعت معرکہ پاکستان میں ایک فاش غلطی کا شکار ہوئی۔ آج بھی اس کا بنیادی نقطۂ نظر جوں کا توں ہے۔ مسلمانوں کے "ملی مفاد" اب بھی اس کی نظر میں ہیچ ہیں۔ چنانچہ قیام پاکستان کے بعد بھی (مثلاً جہاد کشمیر کے مسئلہ میں) وہ اسی طرح برابر غلطیوں کا شکار ہو رہی ہے اور قیاس کہتا ہے کہ آئندہ بھی ہوتی رہے گی۔

سیاسی نقطۂ نظر سے اس صورت میں قوم کے لئے جو خطرات پنہاں ہیں وہ محتاج بیان نہیں لیکن چونکہ بنیادی طور پر اسلامی جماعت کو مسلمانوں کے ملی مفاد کا کوئی احساس نہیں اس لئے یہ امر یقینی ہے کہ اسلامی قانون کی ترجمانی کرتے وقت بھی وہ قومی مصلحتیں جن کو پورا کرنے کے لئے حضرت امام ابوحنیفہ رحؒ نے "استحسان" کا اصول وضع فرمایا تھا انہیں یا تو پوری طرح سمجھ نہ سکیں گے۔ یا نظر انداز کر دیں گے مثلاً سود اور بیمہ دو ایسے مسائل ہیں جن کو مناسب طور پر حل کئے بغیر جدید دور میں کسی ملک کی معاشی ترقی نہیں ہو سکتی۔

بیمہ کے متعلق کوثر کے ایک پرچے میں ایک اسکول ماسٹر صاحب نے کوثر کے ایک مضمون کی شکایت کی جس میں زندگی کا بیمہ کرانے کی مخالفت کی گئی تھی۔ اور کہا "کاش کہ آپ بوڑھوں۔ بیواؤں اور یتیموں کے درد اگر عملاً نہیں تو عالم تخیل ہی میں دیکھ سکتے"

اس پر اخبار کوثر نے تبصرہ کیا:-

"جب ہم بیمہ کے مسئلہ پر غور کرتے ہیں تو سب سے پہلے سوال اس کے "نفع و نقصان" کا نہیں بلکہ اس کی شرعی حیثیت کا ہے۔ اگر شرعی حیثیت سے بیمہ سود اور جوئے کے امتزاج پر مبنی ہے تو فضول خرچ مسلمانوں کی خاطر اس کو جائز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ البتہ اگر یہ ثابت کر دیا جائے کہ اس میں شرعی اصول سے کوئی قباحت نہیں تو ہم اپنے مسلک پر نظر ثانی کرنے کو تیار ہیں"۔

اس تبصرے میں جس طرح بیمہ کو "سود اور جوئے کا امتزاج" قرار دیا گیا ہے۔ اور ایک اہم معاشی ترکیب کے متعلق جس غلط فہمی کا اظہار ہوا ہے۔ ہم اس پر اس جگہ بحث کرنا نہیں چاہتے۔ صرف "شرعی اصول" اور "نفع و نقصان" کے تضاد کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں۔ فاضل ایڈیٹر نے قرآن کریم کی کوئی آیت نقل نہیں کی، نہ کسی حدیث کا ذکر کیا۔ اور بیمہ کی حرمت قائم کر دی۔ ایک مسئلہ کے متعلق "شرعی اصول" ایک ایسی وسیع اور مبہم ترکیب ہے کہ شاید اس کے ماتحت فاضل ایڈیٹر صاحب کا اپنا فتوی بھی آجائے لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ دلائل و شواہد دئے بغیر شرعی فتوے دینا اور مسلمانوں کو ایسے طریقوں سے باز رکھنا جن سے وہ لاوارث بچوں، بیواؤں اور یتیموں کو مصائب و تکالیف سے بچانے کا انتظام کر سکیں۔ ایک بڑی زیادتی ہی نہیں فریب بھی ہے۔ مسئلہ زیر بحث میں بیمہ کی مخالفت میں کوئی چیز نص قرآنی کی قسم کی نقل نہیں ہوئی۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ جن معاملات کے لئے صریح نص قرآنی بھی موجود ہے۔ جماعت اسلامی کے راہنما بعض حالات میں ان میں بھی نص قرآنی کے احکام کو ملتوی کر دینے کا حق اپنے لئے جائز سمجھتے ہیں۔ لیکن عام مسلمانوں کے مبہم یا غیر واضح معاملات اور ایسے مسائل میں بھی جن کی ماہیت وہ صحیح طور پر نہیں سمجھتے۔ وہ عام مسلمانوں کو "شرعی اصول" کے تحت ایسے طریق کار کا پابند کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جس میں انفرادی اور اجتماعی خطرات اور نقصانات پنہاں ہیں۔ مثلاً چور کے لئے کلام مجید میں "قطع ید" کا حکم ہے۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے مولانا مودودی نے ایک تقریر میں موجودہ سوسائٹی کا نقشہ کھینچا اور فرمایا کہ:-

"اس سوسائٹی میں تو چور کا ہاتھ کاٹنا گیا معنی شاید اکثر حالات میں تو اس کو سرے سے کوئی سزا دینا

ہی درست نہیں "

مولانا مودودی نے جو ارشاد فرمایا وہ عقل کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے۔ مشہور واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ جب عرب میں قحط پڑا تو حضرت عمر فاروق رضؓ نے چوروں کے لئے قطع ید کی قرآنی سزا ملتوی کر دی تھی۔ اور اگر اسلامی قانون کو سوچ سمجھ کر اور وقتی مشکلات کا اندازہ کر کے نافذ کیا جائے تو شاید کبھی کبھی شرعی احکام کو ملتوی بھی کرنا پڑے۔ لیکن عام مسلمانوں کو مولانا سے پوچھنے کا حق ہے کہ اگر قرآن کریم کی نافذ کی ہوئی سزا علما کی رائے کی بنا پر ملتوی کی جا سکتی ہے تو جن معاملات میں کوئی واضح حکم نافذ نہیں ہوا۔ اور جو فی الحقیقت پیدا ہی نئے دور میں ہوئے (مثلاً بیمہ) ان کے متعلق قطعیت کے ساتھ مسلمانوں کو علما کی فاتی رائے اور ایسے فیصلوں کا پابند کرنا جن سے بدیہی طور پر معاشرہ میں تکالیف اور دشواریاں بڑھیں کہاں کا انصاف ہے؟

اسی طرح سود کا مسئلہ ہے۔ اسلام میں سود کے متعلق چند احکام ہیں لیکن جامع ازہر کے علما اور بعض دوسرے اسلامی ممالک کے مفتیوں نے فتوے دئے ہیں۔ جن کی رو سے بنکوں کا کاروبار جائز قرار دیا گیا ہے لیکن اسلامی جماعت کے نزدیک بنکوں کا سود مہاجنی سود سے بھی بدتر ہے۔ اب واقعہ یہ ہے کہ اگر تجارت کو بساطی کی دوکان یا ٹھیلے کے کاروبار سے (جن پر چودہ گھنٹے کام کرنے کے بعد ہمارے ذی نوجوان جو دماغی طور پر بڑے بڑے کارخانے چلانے کی صلاحیت رکھتے ہیں بمشکل چودہ آنے کماتے ہیں) آگے بڑھانا اور صنعت و حرفت کو وسعت دینا ہے تو پیداوار کے چوتھے عنصر سرمایہ[1] کا بھی انتظام کرنا ہوگا یہ انتظام یا تو بنکنگ کی ترقی سے ہو سکتا ہے۔ یا سرمایہ کو قومی ملکیت قرار دینے (SOCIALISATION OF BANKING) سے یعنی یا تو بیت المال کے تخیل کو اتنی وسعت دیجئے کہ اس کے ماتحت نئی خزانہ ہی نہیں بنکنگ کا انتظام بھی آجائے۔ یا کسی اور ذریعہ سے بنکوں پر حکومت کا قبضہ اور کنٹرول ہو۔

---

[1] علم معاشیات کی رو سے بنیادی طور پر پیداوار (PRODUCTION) کے چار ذرائع ہیں۔ زمین محنت۔ سرمایہ۔ اور تنظیم

لیکن ابھی تک جماعت نے دونوں میں سے کوئی سا طریق بھی اختیار نہیں کیا۔ اور ایک طرف سوشلزم اور دوسری طرف سرمایہ داری کی مخالفت کر کے وسیع پیمانے کی صنعت کاری (LARGE SCALE INDUSTRY) کے سب دروازے بند کر رہی ہے۔ چنانچہ اس موضوع پر لاہور کے اخبار "چٹان" میں ایک مضمون نگار نے لکھا:۔

"کیا جماعت اسلامی کا مقصد پاکستان کی صنعت کو گھریلو کرگھوں اور لوہار کی بھٹی تک محدود رکھنا ہے کیا یہ صریح ملت دشمنی نہیں ہے۔ یاد رکھیئے کہ جس معاشرہ میں سود کی ممانعت ہو وہاں دو ہی نظام پروان چڑھ سکتے ہیں۔ جاگیرداری یا سوشلسٹ نظام۔ انفرادی سرمایہ داری کی ترقی ناممکن ہے۔ جماعت اسلامی سوشلسٹ نظام کی دشمن ہے۔ اس کے دین وایمان کی بنیاد معاشی انصاف کے بجائے شخصی ملکیت پر ہے۔ اس کے تو یہی معنی ہوئے کہ جماعت کا قائم کردہ نظام جاگیرداری یا منصب داری نظام ہی ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ جماعت اسلامی اگر کوئی صورت پیش کر سکتی ہے جس سے ملت مادی طور پر ترقی کرے۔ عوامی بھوک اور افلاس دور ہو۔ معاشی انصاف ہو۔ ملت کا معیار زندگی بلند ہو تو اس کی وضاحت ازراہِ کرم جماعت کے ترجمان فرمائیں"[1]

چٹان کے مضمون نگار صاحب جماعت اسلامی سے ایسے طریقے پوچھتے ہیں۔ جن سے "ملت مادی طور پر ترقی کرے"؛ حالانکہ جماعت کے نزدیک "مادی ترقی" ایک لفظ بے معنی ہے۔ بلکہ اس کا تخیل اور احساس ہی "کافرانہ" تہذیب اور غیر اسلامی ذہنیت کا کرشمہ ہے: "ملی مفاد... ایک خطرناک بت ہے جس کو توڑے بغیر اسلام کا مفاد پورا نہیں ہو سکتا"[2]

---

[1] چٹان لاہور بابت ۱۷ اکتوبر ۱۹۴۹ء۔ [2] مولانا امین احسن اصلاحی۔

پس چہ باید کرد

جب ہم نے اپنی کتاب کا ڈھانچہ مرتب کیا تھا تو ہمارا خیال تھا کہ آخری باب کا عنوان رکھیں گے "مولانا مودودی سے التماس" اور ان سے درخواست کریں گے کہ وہ حکومت اور لیگ کی مخالفت کے بجائے ان سے اشتراک کریں۔ اور پاکستان میں اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی کے لئے سارے فریق متحد ہو کر مصروف عمل ہوں لیکن جب ہم نے اپنی تالیف کے دوران میں اسلامی جماعت کے لٹریچر کا دوبارہ تفصیلی مطالعہ کیا اور اس وسیع خلیج کو دیکھا جو مسلم لیگ اور اسلامی جماعت کے درمیان حائل ہے تو ہمیں یہ کوشش بے سود نظر آئی چونکہ لیگ اور جماعت کا مطمح نظر مختلف ہے۔ اس لئے ان دونوں میں صحیح طور پر اشتراک عمل بہت مشکل ہے۔ مولانا سے ہماری اب بھی یہ درخواست ہے کہ لیگ اور اسلامی جماعت اپنی اپنی کوششیں اس طرح جاری رکھیں کہ ان سے پاکستان کو نقصان نہ پہنچے اور کم از کم راست گوئی اور ان آداب وقوانین کو ملحوظ رکھا جائے جو معمولی دنیادار بھی شریفانہ جماعت بندی میں ضروری سمجھتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ مولانا مودودی کی ذہنی قابلیت اور ان کے اکثر رفقائے کار کی محنت اور جوش وخروش کا قائل ہونے کے باوجود جماعت کا سارا لٹریچر دوبارہ پڑھنے کے بعد ہمیں خدشہ ہے کہ اس جماعت سے پاکستان کو ماضی میں نقصان پہنچا ہے۔ اور مستقبل میں بھی نقصان ہی پہنچے گا۔ اور جس طرح اسلام کے نام پر انہوں نے پاکستان کے بنائے جانے کی مخالفت کی تھی اسی طرح اگر وہ اسلام کے نام پر ہی خدانخواستہ کل پاکستان کو تباہ وبرباد یا نحیف وبے جان کر دیں تو چنداں بعید نہیں۔

ان حالات میں لیگ اور جماعت کے درمیان اشتراک عمل کی خواہش کے بجائے ہم فقط اس جماعت سے خطاب کرتے ہیں۔ جو قائد اعظمؒ کے مواعید اور نصب العین کی قائل تھی اور ہے۔ جو حکیم الامت علامہ اقبالؒ

کی پیروی میں دین اور دنیا جدید اور قدیم کے تقاضوں کو پورا کرنے کی خواہاں ہے۔ اور جو پاکستان کی ترقی اور اس مملکت بلکہ تمام دنیائے اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی کے لئے مفید اور نتیجہ خیز کوششیں کر سکتی ہے۔

مطمح نظر مسلم لیگ اور اس کے راہنماؤں کو سب سے پہلے اپنا موقف واضح طور پر سمجھ لینا چاہیئے۔ چونکہ مسلم لیگ میں بعض ایسے لوگ بھی ہیں جو سیکیولر گورنمنٹ کو پاکستان کے لئے مفید سمجھتے ہیں اور بہت سے ایسے بھی ہیں جن کا نقطۂ نظر اسلامی جماعت سے مل جاتا ہے۔ اس لئے اس افراط و تفریط میں صراط المستقیم معین کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ اور اس راستہ کی کئی ایسی منزلیں ہیں۔ جو آہستہ آہستہ اور آئندہ چل کر ہی معین ہوں گی۔ لیکن لیگ کی گزشتہ تاریخ۔ حکومت پاکستان کے پانچ سال کے رجحانات اور بالخصوص قرارداد مقاصد سے یہ امر طے پا جاتا ہے کہ مسلم لیگ کا مطمح نظر اس ملک میں ایک اسلامی جمہوریت (ISLAMIC DEMOCRACY) قائم کرنا ہے۔ یعنی ایسی حکومت جس میں قانون سازی اور معاملات کو دوسرے طریقوں سے طے کرنے کا اختیار تو جمہور کے نمائندوں کو ہو گا لیکن وہ نمائندے اس اختیار کو اسلامی اصولوں پر استعمال کریں گے۔ اور اپنے ہر اقدام میں "کتاب الہٰی" کے صریح احکام کو پیش نظر رکھیں گے۔

اس مطمح نظر کے ساتھ ساتھ مسلم لیگ کا دوسرا اہم نصب العین پاکستان کا استحکام۔ مسلمانوں کی سربلندی اور مادی ترقی۔ اور اہل پاکستان کی خوشحالی ہے۔

منہیات شرعی کا انسداد جہاں تک مسلم لیگ کے مندرجہ بالا دوگونہ مقاصد کا تعلق ہے۔ مادی ترقی کے سلسلہ میں تو حکومت سے جو کچھ ہو سکتا ہے۔ کر رہی ہے اور اس کے بغیر اس تنازع للبقا کے دور میں کسی ترقی پسند حکومت کے لئے کوئی چارہ ہی نہیں۔ لیکن پاکستان میں اسلام کی سربلندی کے لئے حکومت کو تیز تر قدم اٹھانا چاہیئے۔ اور اس سلسلہ میں یہ ضروری ہے کہ جو امور صریحاً اسلام اور اسلامی احکامات کے خلاف ہیں۔ ان کو ختم کیا جائے۔ مثلاً مسلمانوں کی شراب خوری اور قمار بازی۔ زنان بازاری کا وجود۔ ماہ رمضان کے دوران میں مختلف شہروں میں ایک غیر اسلامی فضا وغیرہ۔ ان میں سے بعض کے متعلق بعض جگہ

قدم بھی اٹھایا گیا ہے ۔ لیکن لیگی حکومت کی واضح اور معین پالیسی یہ ہونی چاہیئے کہ جو امور صریحاً اسلام کے مخالف ہیں اور مسلمانوں کی نظر میں کھٹکتے ہیں انکو مناسب طریقوں سے ختم کیا جائے ۔

"نصف ملت" فواحش و کبائر" کے علاوہ جس چیز کو اسلامی جماعت کے ترجمان سب سے زیادہ اچھالتے ہیں وہ کراچی میں اعلےٰ سوسائٹی کی بعض خواتین کی بے پردگی اور مفروضہ بے حیائی ہے ۔ کراچی میں اس وقت ہزارہا پارسی بستے ہیں ۔ دیسی عیسائیوں کی تعداد شاید ان سے بھی زیادہ ہے ۔ ان دونوں قوموں میں پردہ نہیں اس کے علاوہ یہاں تیس ۳۰ کے قریب خارجی سفارت خانے ہیں ۔ جن کے صدہا ملازم اور ان کی بے پردہ خواتین ہیں ۔ ایک سلطنت کا دارالحکومت اور ایک اہم ہوائی مرکز ہونے کی وجہ سے یہ شہر بیرونی مسافروں کی آمد و رفت کا مقام بھی ہے اس کے علاوہ قیام پاکستان کے بعد جو لوگ یہاں آئے ۔ ان میں بمبئی کے خوجے. بوہرے ۔ میمن ۔ اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں کے ایسے مسلمان بھی بکثرت ہیں ۔ جن میں کبھی بھی پردہ اس طرح رائج نہ تھا جیسے مغربی پنجاب ۔ صوبہ سرحد اور بلوچستان کے شہروں میں ہے ۔ چنانچہ کراچی کے ایک حصے کی معاشرتی فضا لاہور ۔ پشاور اور ملتان کی طرح نہیں ۔ جہاں پارسی ۔ عیسائی اور غیر ملکی خال خال ہیں ۔ اور دوسرے حالات بھی کراچی سے مختلف ہیں ۔

دارالخلافہ میں بھانت بھانت کے آدمی آباد ہیں ۔ اور حکومت نے عام جمہوری اصولوں کے مطابق ان کی معاشرتی زندگی پر پابندیاں لگانے کی کوشش نہیں کی ۔ لوگوں کی سمجھ بوجھ ۔ شرافت اور مسلمانوں کی اسلامی حس پر چھوڑ دیا ہے ۔ اس آزادی کی حالت میں کبھی کبھار کوئی ایسی چیز ہو جاتی ہے ۔ جسے نمک مرچ لگا کر ہزار مبالغہ کے ساتھ اسلامی جماعت کے اخبارات میں اچھالا جاتا ہے ۔ خیر اس میں کوئی مضائقہ نہیں. بلکہ اگر بیان واقعات میں دیانتداری سے کام لیا جائے اور اظہار رائے میں اسلامی عدل، معاملہ فہمی ، اور قومی مصلحت کو نظر انداز نہ کیا جائے تو تنقیدی کوششیں مفید ہی ہو سکتی ہیں ۔ لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ کچھ سیاسی مصلحتوں (یعنی حکمران طبقے کو بدنام کرنے کی خواہش) کی بنا پر اور کچھ جماعت کی عام انتہا پسندی اور

عدل دشمنی کی وجہ سے صحیح صورت حالات پیش نہیں ہوتی۔ اور دونوں فریقوں کی افراط و تفریط سے اسلامی نقطہ نظر آنکھ سے اوجھل ہو رہا ہے۔

مولانا مودودی اور جماعت کے دوسرے ذمہ دار حضرات ضرور اس بات سے باخبر ہوں گے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں برقعہ رائج نہ تھا۔ انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ امام الہند شاہ ولی اللہ رح اور دوسرے علما و فقہا کے نزدیک چہرہ۔ ہاتھ۔ پاؤں اسلامی پردے کی حدود سے باہر ہیں۔ اور وہ اس سے بھی بے خبر نہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں خواتین نماز کے وقت عام مساجد میں مردوں کے دوش بدوش شریک ہوتی تھیں بلکہ جب بعض لوگوں نے کہنا شروع کیا کہ رات کے وقت خواتین کو مسجدوں میں نہیں آنا چاہئے۔ کیوں کہ اس سے خرابیاں پیدا ہونے کا احتمال ہے تو عورتوں کے اس محسن اور انسانی مصلحتوں کے سب سے بڑے راز داں نے فرمایا :-

اذا استاذنکم نساءکم باللیل الی المساجد فاذنوا لهن ۔ — جب تمہاری عورتیں تم سے رات کے وقت مساجد میں جانے کی اجازت طلب کریں تو اجازت دے دیا کرو۔

امام مسلم رح کی ایک روائت میں ہے :-

"لا تمنعوا اماء اللہ مساجد اللہ" — نہ روکو تم اللہ کی بندیوں کو اللہ کی مساجد سے

لیکن اس کے باوجود اسلامی پردہ کی جو تصویر اسلامی جماعت کے اخبارات کے صفحوں پر آتی ہے۔ اس سے تو ایسا خیال ہوتا ہے کہ گویا برقعہ اور اسلام لازم و ملزوم ہیں۔ اور بے پردگی بلکہ "بے برقعگی" بے حیائی کا دوسرا نام ہے۔

پردہ اور برقعہ کے متعلق جو زاویہ نگاہ اسلامی جماعت کے اخبارات پیش کر رہے ہیں۔ اس میں ایسی بہت زیادہ دخل تو ان کی قدامت پسندی اور جماعتی مصلحتوں کو ہے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں جن لوگوں نے پردہ ترک کیا ہے۔ ان میں سے بھی بعض اسلامی نقطہ نظر اور اس کی

مصلحتوں سے بالکل بے خبر ہیں اسلام اور برقعہ لازم و ملزوم نہیں۔ اور اسلام "نصف قوم" کو ان کی صحت ذہنی ترقی اور عام انسانی حقوق سے نہیں محروم کرنا چاہتا لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اسلام اور بے حیائی ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ عہد نبویؐ میں برقعہ اور اس طرز کا پردہ جو ہند و پاکستان کی اسلامی سوسائٹی کے ایک حصے میں رائج ہے۔ ہرگز نہ تھا۔ مگر وہ آزادی اور بے حیائی جو اب مغرب کی معاشرتی زندگی پر اس درجہ حاوی ہے۔ ضرور اسلامی نظام حیات کے خلاف ہے۔ اس مسئلے پر قرآنی ارشادات اور صحیح اسلامی احکام کا منتہائے مقصود فقط یہ ہے کہ معاشرہ میں وہ خرابیاں اور فسادات راہ نہ پائیں جو جذبات کے برانگیختہ ہونے سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور اس مقصد کے لئے مردوں اور عورتوں دونوں کو تلقین کی گئی ہے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں۔ شرم و حیا اور ضبط جذبات سے کام لیں۔ اور عورتوں کو صریح ہدایت ہے کہ وہ باہر نکلتے وقت اپنی زینتوں کو چھپائیں تاکہ جذبات کے برانگیختہ ہونے سے فتنے پیدا نہ ہوں۔ بھلا اس نقطہ نظر کا مغربی نقطہ نظر سے کیا تعلق۔ جہاں شرم و حیا دقیانوسی یا طفلانہ جذبات ہیں۔ جہاں عورت چھوٹی موٹی ایکٹرس بن جاتی ہے اور جہاں صرف زن و مرد کے تعلقات ہی نہیں۔ آرٹ بلکہ کئی صنعتوں (مثلاً فلم انڈسٹری۔ اشتہار بازی) کی بنیاد بھی "جنسی کشش (SEX APPEAL) پر رکھی جاتی ہے۔

رائج الوقت شہری پردہ غیر اسلامی ہے (ملاحظہ ہو ضمیمہ میں علمائے ازہر کا فتوے) اس میں "روح" کی بہ نسبت "قالب" پر زیادہ زور ہے اور اس میں جتنے فائدے ہیں۔ شاید ان سے زیادہ نقصانات ہیں اسلام اور برقعہ ہرگز لازم و ملزوم نہیں۔ اور اسلام "نصف قوم" کو ان کی صحت۔ ذہنی ترقی۔ اور عام انسانی حقوق سے محروم کرنا نہیں چاہتا۔ اس سے نہ صرف خواتین کے ساتھ بے انصافی ہوتی ہے۔ بلکہ "نصف قوم" کی صحت کے کمزور اور ہمتوں اور حوصلوں کے پست ہونے سے اور ان کی صلاحیتوں کے پوری طرح بر سر کار نہ آنے سے پوری قوم کو نقصان ہوتا ہے۔ اور ساری قومی زندگی کا معیار پست ہو جاتا ہے۔ قدیم طریق کا دین تبدیلیاں

ناگزیر ہیں لیکن یہ امر بھی ملحوظِ خاطر رہنا چاہیئے۔ کہ اسلامی آزادی اور مغربی آزادی میں بھی بُعد المشرقین ہے۔

ہمارے خیال میں صحیح اسلامی پردہ کی مثال ہمیں دیہات مثلاً پنجاب کے دیہات میں ملے گی عورتیں برقعے نہیں پہنتیں۔ وہ کام کاج کے لئے کھیتوں میں۔ گاؤں کے مختلف حصوں میں آزادانہ آتی جاتی ہیں۔ ہاتھ اور منہ کھلے رہتے ہیں۔ لیکن نہ ان عورتوں کے ہونٹوں پر لپ سٹک ہوتی ہے۔ نہ رخساروں پر غازہ اور نہ نگاہ میں شوخی، بیباکی و حیاسوزی۔ اسلامی شرم و حیا کا برقعہ سر سے پاؤں تک زیب بدن ہوتا ہے۔ وہ اپنی معصومانہ خوشیوں میں بھی پورا حصہ لیتی ہیں لیکن اپنی سہیلیوں کے ساتھ مردوں سے علیحدہ۔ یا زیادہ سے زیادہ اپنے خاندان کے دائرے کے اندر۔ وہ اپنی ہر طرح حفاظت کر سکتی ہیں لیکن اگر اس آزادی سے کسی خرابی کا امکان ہو تو اس کا انسداد گاؤں والوں کے اخلاقی اثر اور ان کی سوسائٹی کی کڑی نگرانی سے ہو جاتا ہے۔

پاکستان میں زن و مرد کا تعلق اور عام معاشرتی زندگی افراد کی ذمہ داریوں میں سے ہے۔ اس میں حکومت بہت دخل نہیں دے سکتی۔ لیکن طبقہ نسوان یعنی پوری قوم کے نصف حصے کو نظر انداز کرکے کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ قائد اعظمؒ نے ہمیشہ اس پر زور دیا اور اگر پاکستان کو اپنا دوگونہ مطمح نظر حاصل کرنا ہے تو اس کو "مسئلہ زن" بھی احسن طریقے سے حل کرنا ہوگا۔ اس کے لئے بہترین نمونہ زمانِ رسالتؐ اور عہد صحابہؓ کی معاشرتی زندگی میں ملے گا۔ جس کا ایک دھندلا سا خاکہ ہمیں اپنے دیہات میں بھی نظر آتا ہے۔

موجودہ قوانین پر نظر ثانی حکومت پاکستان نے قرار داد مقاصد کو پیش کرکے اس امر کا ذمہ لیا ہے کہ ملکی قوانین میں آئندہ اسلامی روح کارفرما ہوگی۔ اس ذمہ داری کا لازمہ یہ بھی ہے کہ اگر کوئی موجودہ قانون کتاب الٰہی کے مخالف ہے تو اسے بھی بدلا جائے۔

اس سلسلہ میں بعض حلقوں کا خیال ہے کہ حکومت یا مجلس قانون ساز کو فوراً یہ اعلان کر دینا چاہیئے کہ وہ تمام قوانین منسوخ ہیں جو قرآن کریم کے مخالف ہیں۔ یہ تجویز ان حلقوں کی طرف سے قیام پاکستان کے وقت سے پیش ہو رہی ہے۔ لیکن اس تجویز کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مختلف الخیال علما اپنی اپنی تاویلات اور تعبیرات

پیش کریں گے۔ اور مختلف عدالتیں مختلف فیصلے کرنا شروع کر دیں گی کہ فلاں قانون یا قاعدہ قرآن کریم کے خلاف اور اس لئے منسوخ ہے۔ اس سے ملک میں شدید قسم کی بدنظمی اور لاقانونیت رائج ہو جائیگی جس سے بچنے کا یہی طریقہ ہے کہ جن قوانین یا قواعد کو منسوخ کرنا ہے۔ ان کے متعلق مجلس قانون ساز میں باقاعدہ بل پیش کیا جائے۔ حکومت نے اس سلسلہ میں ابتدائی قدم یہ اٹھایا ہے۔ کہ علما اور ماہرین قانون کا ایک کمیشن قائم کر دیا ہے۔ تاکہ وہ رائج الوقت قوانین کا قرارداد مقاصد کی روشنی میں مطالعہ کرے۔ اور اگر کسی قانون میں تغیر و تبدل کی ضرورت ہو تو مناسب تجاویز پیش کرے۔ جو مجلس قانون ساز کے سامنے لائی جائیں۔ ظاہر ہے کہ بے شمار قوانین کا موضوع ہی ایسا ہے جس کا قرآن کریم اور سنت نبوی سے نہ کوئی تعلق ہے نہ کوئی تصادم ہوتا ہے۔ اور قومی نقطہ نظر سے بھی یہ امر مضر ہے کہ تمام قانونی نظام بہ یک وقت یا بلا اشد ضرورت تبدیل کیا جائے۔ اور لوگوں کے دل میں قانونی نظام کے متعلق عام طور پر ششش و پنج کی حالت پیدا کی جائے۔ اس لئے انہی قوانین کو سب سے پہلے لینا چاہئے۔ جو صریحاً قرآن اور سنت کے خلاف ہیں۔ اور کوئی عملی اہمیت رکھتے ہیں۔

چونکہ کئی صدیوں سے ہندوستان یا پاکستان میں شرع اسلامی رائج نہیں رہی۔ اس لئے بدقسمتی سے ہمارے ہاں کوئی ایسا جید عالم یا فقیہہ نظر نہیں آتا جس کے علم و فضل اور رائے پر سب معاملہ چھوڑا جاسکے۔ لیکن ایک ایسے کمیشن کے قیام سے جس میں جدید اور قدیم طرز کے عالم اور قانون دان ہوں۔ اس معاملہ پر غور و خوض ہو سکتا ہے۔ یقین ہے کہ یہ کمیشن اسلامی قانون کے متعلق ان تصانیف کو بھی زیر نظر رکھے گا۔ جو مصر۔ شام اور دوسرے اسلامی ممالک میں گزشتہ دو تین سو سال میں معرض تحریر میں آئی ہیں۔ اور جن سے پاکستان اور ہندوستان کے علما ابھی تک بے خبر ہیں۔ کمیشن کے قیام کے ساتھ ساتھ مرکزی حکومت کے محکمہ قانون میں ایک اس طرح کا صیغہ قائم ہونا چاہئے جو اس مقصد کے لئے قانونی لٹریچر فراہم کرے۔ عربی اور دوسری زبانوں میں فقہ اسلامی کے متعلق جو مواد ہے یکجا کرے۔ اور کمیشن کے کام کے لئے (ریاجہزودی) معلومات

میں اسلامی فقہ کے مطابق رائے دینے میں سہولتیں بہم پہنچائے۔

قوانین پر اسلامی نقطہ نظر کا اہتمام کرنے کے ساتھ ساتھ حکومت نے یہ امر واضح کر دیا ہے۔ کہ وہ کسی طرح کی بدنظمی اور لاقانونیت برداشت نہیں کرے گی۔ اگر کسی کو موجودہ قوانین میں کوئی چیز ناپسند ہے۔ تو اس کے لئے عملی طریق کار یہی ہے۔ کہ مجلس قانون ساز کے ارکان کی وساطت سے قانون میں ترمیم کے لئے جدوجہد کرے لیکن حکومت کسی کو یہ اجازت نہ دے گی۔ کہ وہ رائج الوقت قوانین کی خلاف ورزی کرے۔ یا اپنی مرضی کے مطابق اصول بنالے۔ اور ان پر عمل شروع کر دے۔ حکومت کی اس پالیسی کا تمام سمجھدار اور محب وطن طبقوں نے خیر مقدم کیا ہے۔ ظاہر ہے۔ کہ جب تک ملک میں نظم ونسق کا ڈھانچہ پوری طرح قائم ہے۔ اس وقت تک کسی اصلاح کی امید ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر خدانخواستہ ملک میں بدنظمی پھیل گئی۔ تو اصلاح کی امید تو ایک طرف، خود ملک کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔

پاکستان کی معاشی پالیسی | ملکی قوانین پر نظرثانی کے علاوہ وقت کا ایک اہم مسئلہ معاشی نظام ہے قائداعظم اور قائد ملت نے بارہا اپنی تقریروں میں کہا ہے کہ پاکستان میں نہ تو اشتراکی نظام ہوگا نہ سرمایہ دارانہ۔ بلکہ یہاں اسلام کا معاشی نظام برسرِکار آئے گا اپنی بعض تقریروں میں انہوں نے اسلام کے اس معاشی نظام کو اسلامک سوشلزم کا نام دیا ہے۔ لیکن ابھی تک اس جملے کی توضیح نہیں ہوئی اور فی الواقع جب تک بنک کاری صنعت وحرفت اور زمین کی ملکیت کے مسائل پر احکام اسلامی اور قومی مصلحتوں پر غور کر کے مسلم لیگ پارٹی ایک مفصل اور مدون طریق کار طے نہ کرے عام اور مبہم منصوبوں کے ذکر کے علاوہ عمل مشکل ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان مسائل پر بھی غور وخوض ہو اور سیاسی لیڈروں۔ اقتصادی ماہرین اور ان علما کی مدد سے جو ان مسائل کو پرکھ سکتے ہیں۔ حالات کا موازنہ کر کے حکومت اپنی معاشی پالیسی مرتب کرے۔

محکمہ امور مذہبی | پاکستان میں اسلام کی مذہبی اہمیت کے متعلق مسلم لیگ نے جو تجاویز کی ہیں۔ ان کا تقاضا ہے کہ پاکستان کی لیگی حکومت ایک محکمہ امور مذہبی و اوقاف قائم کرے۔ قرارداد مقاصد کے

پیش کرتے وقت جو تقریریں ہوئی تھیں۔ ان میں یہ امر واضح کر دیا گیا تھا کہ پاکستان ایک کلیسائی حکومت نہیں ہوگی۔ لیکن اس قرارداد کے تحت حکومت کو بعض مذہبی معاملات کی ذمہ داری لینی ہوگی۔ اور مناسب ہے کہ ان کے لئے ایک علیحدہ محکمہ قائم ہو تاکہ ایسے علما کی مدد سے جو سیاسی ولولے نہیں رکھتے بلکہ دین وملت کی ٹھوس خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ ان چیزوں کا اہتمام ہوتا رہے۔

دوسرے امور کے علاوہ اس محکمہ کا ایک اہم کام مساجد کی تنظیم اور ائمہ کی تعلیم و تربیت اور ان کی اقتصادی مشکلات کا حل ہوگا۔ ہمارے ہاں خطباتِ جمعہ عوام الناس کی دینی اور اخلاقی اصلاح کا بڑا ذریعہ بن سکتے ہیں، لیکن افسوس، ان سے کماحقہٗ فائدہ نہیں اٹھایا جا رہا۔ امید ہے۔ محکمہ امور مذہبی کے قیام سے اس طرف پوری توجہ دی جا سکے گی۔

اسلامی اخلاق وخصائل پر زور یہ چند چیزیں ایسی ہیں جن کے متعلق ٹھوس قدم اٹھایا جا سکتا ہے۔ لیکن ان سے زیادہ اہم چیز اسلام کی روح ہے جسے اخذ کرنا سب سے مقدم اور سب سے ضروری کام ہے۔ افسوس کہ سیاسی پارٹیاں اس کی اہمیت نہیں سمجھتیں (بلکہ جو جماعت اپنے آپ کو اسلامی کہتی ہے وہ بھی چونکہ روحانی اور دینی میدان کو چھوڑ کر سیاسیات کے میدان میں معرکہ آرا ہے) اس لئے وہ نیک روحانی اثرات جو عام طور پر مذہبی طبقے کی طرف سے تمام امت پر کارفرما ہوتے ہیں روز بروز کم ہو رہے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اسلامی اخلاق اور اوصاف سے متصف ہونا وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ قول وفعل اور خیال کی پاکیزگی۔ بات کی سچائی، معاملہ کی درستگی۔ بے حرصی۔ ایثار۔ خدا کا خوف۔ اختلاف و مخالفت میں اخلاق اور دیانت کے اٹل اصولوں کو نظر انداز نہ کرنا یہ چیزیں انفرادی اور اجتماعی زندگی کا رنگ بنیاد ہیں۔ اور جس طرح بھی ممکن ہو پاکستان کے رہنماؤں کو ان کی ترویج کی کوشش کرنی چاہیئے۔

. . . . مسلم لیگ کو اس امر کا بھی خاص طور پر خیال رکھنا چاہیئے کہ وہ حکمران طبقہ یا اہل ثروت گروہ کی جماعت نہ بن جائے۔ پاکستان کی لڑائی میں لیگ کو جو غیر معمولی

کامیابی ہوئی اس کی وجہ یہ تھی کہ تمام قوم لیگ کے ساتھ تھی اور کسی طبقاتی فائدہ کے لئے نہیں۔ بلکہ صحیح و الہانہ جذبہ و جوش کے ساتھ مصروف عمل تھی۔ پاکستان کے قیام کے بعد اسلامی جماعت اور بعض دوسرے لوگوں نے ارباب حکومت کو جس طرح مسلسل بدنام کرنے کا لائحہ عمل بنایا ہے اس سے بعض لوگوں کے دل کھٹے ہو گئے ہیں۔ اور قوم آزادی کے بعد اس جوش اور یکجہتی کے ساتھ عمل پیرا نہیں ہوئی۔ جو ایک نئی قوم اور ایک نئے ملک کے لئے ضروری ہے۔ لیکن اب بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو حب وطن اور اسلامی جذبہ کے نشے سے سرشار ہو کر ارض پاک کی خدمت کرتے ہیں۔ اور لیگ ہی کے لئے نہیں بلکہ پاکستان کی بقا اور ترقی کے لئے ضروری ہے کہ اس جذبہ کو ترقی دی جائے۔ اس مقصد کے لئے لیگ کو ان تمام مخلص اور دردمند افراد اور جماعتوں کی قدر کرنی چاہئے جو کسی مادی یا جماعتی فائدے کے لئے نہیں بلکہ قومی جذبہ سے متاثر ہو کر ملک و قوم کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔

ہندوستان میں صدیوں تک جو اسلامی حکومت قائم رہی۔ بلکہ اس ملک میں آج جو مسلمان نظر آتے ہیں اس کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ مسلمان حکمرانوں کے ساتھ ساتھ بڑے قابل مخلص اہل اللہ بزرگ کارفرما تھے۔ پاکستان میں آج بھی ایسی ہستیاں موجود ہیں جو انہی جذبات سے متاثر ہو کر ملک و قوم کی سربلندی کا اہتمام کریں گی۔ لیکن ارباب حکومت کو چاہئے کہ وہ اس "متاع عزیز" کی قدر کریں انہیں تلاش کریں اور ان کی کامیابی کے لئے سہولتیں بہم پہنچائیں۔ بلکہ ہمارے خیال میں تو حکومت کو انجمن خدام پاکستان (SERVANTS OF PAKISTAN SOCIETY) یا کسی ایسے اور ادارے کی تشکیل کا انتظام کرنا چاہئے جن میں وہ نیک ہستیاں جو خدمت خلق کو اپنا ایمان سمجھتی ہیں اور پاکستان کو اسلام کی خدمت کا ذریعہ خیال کرتی ہیں (SERVANTS OF INDIA SOCIETY) کے ارکان کی طرح قوت لایموت پا کر اپنی زندگیاں خدمت خلق کے لئے وقف کر سکیں۔ اور قوم کی اخلاقی روحانی اور معاشرتی سطح بلند کرنے کا ذریعہ بنیں۔

پاکستان کا مشن حکومت پاکستان پر نکتہ چینی کرتے وقت اسلامی جماعت بسا اوقات انصاف کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتی ہے۔ لیکن اسے بھی اس امر کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ مصر، سعودی عربستان، افغانستان اور اس طرح کے دوسرے اسلامی ممالک کی نسبت پاکستان میں جمہوری آزادی بہت زیادہ ہے[1]۔ حکومت ایک نظام اور آئین پر قائم ہے۔ سرکاری ملازمتیں وزرا یا ارکان حکومت کی خوشنودی یا دوست پروری کا صلہ نہیں۔ بلکہ تمام اہم ملازمتوں کے لئے آزاد پبلک سروس کمیشن قائم ہیں۔ عدلیہ پوری طرح آزاد ہے۔ اور ہائی کورٹ آئے دن حکومت کے خلاف فیصلے صادر کر رہے ہیں۔ پریس سیکیورٹی ایکٹ کے خلاف چیخا رہتا ہے لیکن جو عملی آزادی رائے پاکستان میں حاصل ہے۔ اور جس طرح ہر روز اخبارات میں بڑے بڑے ارکانِ حکومت پر نکتہ چینی ہوتی ہے۔ اس کا تصور بھی کسی دوسرے اسلامی ملک میں نہیں ہوسکتا۔ عمالِ حکومت کے ایک حصے میں ضرور خرابیاں ہیں (لیکن کسی اسلامی ملک میں اس سے کم نہیں) اور بہرکیف حکومت ان کے قلع قمع کے لئے ہر وقت کوشاں ہے۔ ایک علیحدہ محکمہ سپیشل پولیس کا اس مقصد کے لئے قائم کیا گیا ہے۔ اور آئے دن چھوٹے بڑے افسروں کے خلاف قانونی کارروائی کی خبریں اخبارات میں آتی رہتی ہیں۔ بڑے بڑے جبار وزرا کو انتظامی بدعنوانیوں کی وجہ سے پروڈا کے ماتحت وزارت کی گدی سے جس طرح علیحدہ کیا گیا ہے۔ اس کی مثالیں اس برصغیر میں بہت کم ملیں گی[2]۔ فوجی اخراجات کی زیادتی نے حکومت کا کام بہت مشکل کر دیا ہے لیکن عوام کی فلاح و بہبود کے لئے متواتر کوشش کرتی رہی ہے۔ اور آئندہ کی نسبت جو امیدیں پاکستان سے وابستہ ہوسکتی ہیں وہ کسی دوسرے ملک سے نہیں۔

---

[1] مثلاً مسعود عالم ندوی صاحب عرب میں ایک عالم سے اپنی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں "وہیں ایک صاحب علم ملے جن کی نظر سے رسالہ ترجمان القرآن کا تازہ پرچہ گزر چکا تھا۔ بولے "تم لوگ حکومت پاکستان کے شاکی ہو۔ اور یہ شکوہ ایک حد تک بجا بھی ہے مگر اس پرچے میں جتنا کچھ نعیم صاحب نے لکھا ہے اگر اس کا عشر عشیر بھی یہاں لکھا جائے تو رسالہ کی ضبطی کے لئے کافی ہے" راقم نے عرض کیا "شخصی اور جمہوری حکومتوں کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہے"۔
("دیارِ عرب میں" صفحہ ۲۷۶)

دوسرے اسلامی ممالک بھی جب وہ اپنے خاص ملکی مفاد یا دوسرے کے پراپاگنڈے سے متاثر نہیں ہوئے پاکستان کی نسبت یہی رائے رکھتے ہیں۔ اور پاکستان نے بین الاقوامی مجالس میں مختلف اسلامی ممالک مثلاً فلسطین۔ طرابلس۔ اطالوی۔ سومالی لینڈ۔ تونس کے لئے جو کوششیں کی ہیں۔ انہیں بنظر استحسان دیکھتے ہیں۔ لیکن اسلامی ممالک میں پاکستان نے جو درجہ حاصل کر لیا ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ نہیں کہ پاکستان نے اسلامی ممالک کا ضرورت کے وقت ہاتھ بٹایا ہے۔ بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ پاکستان کو ایک بڑی اور متمدن سلطنت سمجھا جاتا ہے۔ ترکوں نے جو عربوں کی بغاوت کے بعد بالعموم اور کمالی اصلاحات کے بعد بالخصوص عرب اور اسلامی ممالک سے بالکل علیحدہ رہے۔ پہلی دفعہ پاکستان کے اصرار پر انٹرنیشنل اسلامک اکنامک کانفرنس میں عرب ممالک کے پہلو بہ پہلو بیٹھنا قبول کیا۔ اسلامی ممالک پاکستان کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اور اس کی خواہشات کا احترام کرتے ہیں۔ وہ محض اس وجہ سے نہیں کہ پاکستان ایک اسلامی مملکت ہے بلکہ اس وجہ سے بھی کہ پاکستان ایک متمدن اور مضبوط ملک ہے جس کا نظم ونسق ایک تجربہ کار اور بااصول سول سروس کے ہاتھ میں ہے۔ اور جس کی عسکری حالت ان عرب اور اسلامی ممالک کی طرح نہیں جن کی فوجیں قدیم ہندوستانی ریاستوں کی نام نہاد فوجوں کا نمونہ ہیں۔ اور پاکستان کے راہنما بین الاقوامی مجالس میں بھی (کم از کم دوسرے اسلامی ممالک سے بہت زیادہ) موثر ومفید کارروائی کر سکتے ہیں۔

پاکستان نے اپنی خامیوں۔ کوتاہیوں۔ ناتمامیوں کے باوجود جو درجہ حاصل کر لیا ہے اس میں ارباب پاکستان کے دوگونہ مطمح نظر کو بھی دخل ہے۔ ترکی اور بعض دوسرے اسلامی ممالک نے اسلامی قانون کو ترک

(بقیہ فٹ نوٹ)

ہے انگلستان کے مشہور اخبار اکانومسٹ نے پاکستان کے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا: "سندھ میں رشوت ستانی اور دوست پروری نئی چیزیں نہیں۔ لیکن یہ بات بالکل نئی ہے۔ کہ ان الزامات کی بنا پر دو وزرائے اعظم اپنے عہدوں سے علیحدہ کر دئے گئے ہیں"۔

کر دیا اور کہہ دیا کہ مادی ترقی اور اسلامی قانون میں ہم آہنگی نہیں ہو سکتی۔ لیکن پاکستان کے مفکر اعظم حکیم الامت علامہ اقبالؒ اور قائد اعظمؒ کے خیالات کا ماحصل یہ تھا کہ یہ ہم آہنگی ممکن ہے بلکہ پاکستان کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ انشاءاللہ دنیا کو دکھا دے گا کہ ہم اسلامی اصولوں پر چلتے ہوئے اور واضح اسلامی قوانین کی پابندی کرتے ہوئے پوری مادی ترقی ملکی استحکام اور فلاح عوام کا انتظام کر سکتے ہیں۔

پاکستان نے اپنے سامنے ایک دور دراز کی منزل رکھی ہے۔ اس دوگونہ مطمح نظر کو پوری طرح حاصل کرنا سہل نہیں۔ اس راہ میں بڑے پیچ و خم ہیں۔ اور بڑے مشکل مقامات سے دوچار ہونا پڑے گا۔ لیکن یہی مشکل مقامات قوم کی ذہنی علمی اور روحانی قوتوں کا امتحان ہوں گے۔ اور امید ہے کہ جس قوم نے امام الہند شاہ ولی اللہؒ اور حکیم الامت علامہ اقبالؒ جیسی ہستیاں پیدا کیں۔ وہ ان مشکل مقامات کو بھی عبور کرے گی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ دین و دنیا، جدید و قدیم کی اس کشمکش کو حل کئے بغیر اسلامی ممالک کے لئے کوئی مستقبل نہیں۔ اگر وہ خدانخواستہ اسلام سے ہاتھ دھو بیٹھے اور اس طرح انتہائی مادی ترقی حاصل کر لی۔ تب بھی ہمیں اس سے کیا خوشی ہو سکتی ہے لیکن اگر ان کی مادی ترقی اور ملکی استحکام کا خاطر خواہ انتظام نہ ہو سکا تو انہیں غیروں کی غلامی اختیار کرنی پڑے گی اور دوسرے اگر عام مسلمان کی وہی حالت رہی جو مشرق وسطیٰ کے بعض علاقوں میں ہے (جن کی تین مشترکہ خصوصیتیں افلاس، جہالت اور گندگی بیان کی جاتی ہیں[۱]) تو سوائے اس کے کہ یہ علاقے اسلام کے نام پر کلنک کا ٹیکہ بنے رہیں اور کیا ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر پاکستان نے اپنے دوگونہ مقصد کو پا لیا اور دین و دنیا کی ہم آہنگی کا راستہ ڈھونڈ لیا۔ تو نہ صرف اس ملک کی دینی اور دنیوی ضروریات کا بوجہ احسن انتظام ہو جائے گا۔ بلکہ ایک ایسی مثال بھی قائم

---

[۱] مولانا مسعود عالم اپنے ایک بخاری رفیق ہم سفر کے متعلق لکھتے ہیں "بہرحال آدمی معقول تھا۔ اور سعودی عرب کے متعلق اس نے صاف بات کی "وہاں مرض۔ فقر۔ اور جہل کا ثالوث سوار ہے"۔

ہو جائے گی جس سے وہ بنیادی مسائل جو اس وقت تمام ممالک اسلامی کو درپیش ہیں۔ ان ممالک میں بھی ٹھیک طرح حل ہو جائیں گے۔

ہم بارگاہِ باری تعالیٰ میں دعا کرتے ہیں کہ وہ پاکستان اور اہل پاکستان کی راہنمائی کرے اور انہیں اس دوگونہ مقصد کے حصول کی توفیق عطا کرے جو اس قرآنی دعا میں بیان کیا گیا ہے :۔

"رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ"۔

(ضمیمہ)

پردہ اور اسلام

جامعہ ازہر کے علماء کا فتوےٰ

سوال :۔ ایک صاحب عبدالقادر شہابی نے یافہ (فلسطین) سے مندرجہ ذیل استفتا جامعہ ازہر کی مجلس افتا کے پاس ارسال کیا ہے:۔

"میں امید کرتا ہوں کہ جناب والا اس مسئلہ کے متعلق فقہائے اسلام کا صحیح مسلک بیان فرمائیں گے کہ عورت کو راستہ چلتے وقت اجنبی مردوں سے پردہ کرنا اور چہرہ چھپانا ضروری ہے یا نہیں۔ براہِ کرم اس حکم شرعی کی حکمت بھی بیان فرمائیے اور آیہ شریفہ یاایھا النبی قل لازواجک الخ کا مطلب واضح فرمائیے۔

جواب :۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ نور میں ارشاد فرمایا ہے :۔ وقل للمومنات یغضضن من ابصارھن و یحفظن فروجھن ولایبدین زینتھن الا ماظھر منھا ولیضربن بخمرھن جیوبھن (ترجمہ) اور کہہ دے ایمان والیوں سے نیچی رکھیں ذرا اپنی آنکھیں اور تھامتی رہیں اپنے ستر کو اور نہ دکھلائیں اپنا سنگار مگر جو جو کھلی چیز ہے اس میں سے اور ڈال لیں اپنی اوڑھنی اپنے گریبانوں پر"۔

اس آیہ شریفہ میں اجنبی عورت اور مرد کے درمیان شرعی پردے کے حدود بیان کئے گئے ہیں۔ اس آیہ شریفہ کی توضیح میں چند احادیث صحیحہ بھی وارد ہیں۔ جو بخاری، مسلم، اور دیگر کتب معتبرہ میں مذکور ہیں۔ اس آیہ شریفہ اور متعلقہ احادیث کے مفہوم کے تعین میں فقہائے اسلام مختلف نتیجے پر پہنچے ہیں۔ بنابریں اس مسئلہ میں کہ عورت اپنے بدن کے کسی حصہ کو اجنبی مرد کے سامنے کھول سکتی ہے فقہا کے مذاہب مختلف ہیں۔ چنانچہ امام احمد بن حنبل اور امام شافعی کا ایک قول ہے کہ "مسلمان عورت کے لئے قطعاً جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے بدن کا کوئی حصہ کسی اجنبی مرد کے سامنے کھولے لیکن ضرورت کے وقت اس کی اجازت ہے"۔ ضرورت شرعی سے مراد یہ ہے کہ عورت کو علاج کی ضرورت درپیش ہو یا اس کو شہادت دینی پڑے یا بیع و شریٰ کے معاملہ کی تکمیل ضروری ہو یا شادی کا پیغام دیتے وقت مرد عورت کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کرے۔ دونوں حضرات کی رائے یہ ہے کہ "لایبدین زینتھن" کے بعد "الا ماظھر منھا" سے ان صورتوں کا استثناء مقصود ہے جن سے غیر ارادی طور پر بدن کا کوئی حصہ کھل جاتا ہے جیسے ہوا کے جھونکے سے پلو ہٹ جائے اور سینہ یا پنڈلی نمودار ہو جائے اس قسم کی صورتوں میں عورتوں کے بدن کے کسی حصے کا اجنبی مرد کے سامنے نمودار ہونا قابل مواخذہ نہیں ہے۔ احناف اور امام شافعی کا قول ثانی اور مالکیہ کا مفتی بہ قول یہ ہے کہ "عورت کے لئے اس امر کی اجازت ہے کہ وہ راستہ میں چلتے

پھر تملو اجنبی مردوں کے سامنے اپنے چہرے اور ہاتھوں کو کھلا رکھے"۔ ان حضرات کی رائے میں آیۂ شریفہ کا مفہوم یہ ہے کہ عورت کو اجنبی مرد کے سامنے اعضائے بدن کھولنے کی اجازت نہیں ہے باستثناء ان اعضا کے جو عادتاً کھلے رہتے ہیں اور وہ اعضا چہرہ اور دونوں ہاتھ ہیں۔ لیکن ان حضرات نے اجازت کو مشروط کیا ہے۔ اس وقت سے جبکہ فتنے کا خوف نہ ہو اور اگر چہرہ اور ہاتھوں کے کھولنے میں اس امر کا خوف ہو کہ بدنیت اور شریر النفس لوگ عورت کی عصمت پر حملہ کرینگے اور عورت کی عصمت خطرے میں پڑ جائے گی تو ایسی صورت میں عورت کے لئے ضروری ہے کہ وہ بقیہ اعضائے بدن کی طرح چہرہ اور ہاتھوں کو بھی اجنبی مرد کی نظروں سے پوشیدہ رکھے۔ کیونکہ اس امر میں کوئی شک نہیں کہ فتنے کا سدِ باب کرنا اور آدمی کی عزت و عصمت کی حفاظت کرنا بھی مقاصدِ اسلام میں داخل ہے۔ فقہائے اسلام کے یہ مذاہب ہیں۔ اِس مسئلہ میں کہ عورت اپنے بدن کے کس حصہ کو اجنبی مرد کے سامنے کھول سکتی ہے اور کس حصے کو نہیں کھول سکتی۔ اور جیسا کہ ہم نے بیان کیا یہ اختلاف اس امر پر مبنی ہے کہ آیۂ شریفہ میں "الاما ظھر منھا" سے کیا مراد ہے؟ خلاصہ یہ ہے کہ بعض ائمہ اس بات کو ہرگز جائز نہیں سمجھتے کہ عورت شرعی ضرورت کے بغیر اپنے بدن کے کسی حصے کو بھی اجنبی مرد کے سامنے کھولے اور جمہور ائمہ چہرے اور ہاتھوں کا کھولنا جائز سمجھتے ہیں۔ بشرطیکہ فتنہ کا خوف نہ ہو۔ اور اگر فتنہ کا خوف ہو تو عورت اجنبی مرد کے سامنے نہ چہرہ کھول سکتی ہے نہ بدن کا کوئی اور حصہ۔ **"یسر دین اور سد باب الفساد"** یہ دو بڑے اسلامی اصول ہیں۔ ان دونوں اصولوں کے مدِ نظر مجلسِ افتا اس قول کو ترجیح دیتی ہے کہ چہرہ اور ہاتھ ستر عورت نہیں ہیں۔ لہٰذا اس امر میں کوئی حرج نہیں ہے کہ عورت ان کو اجنبی مرد کے سامنے کھولے۔ تاکہ معاملات میں حرج واقع نہ ہو لیکن اگر فتنہ کا خوف ہو تو تمام بدن کا پوشیدہ رکھنا ضروری ہے۔ مجلس ہذا اس بات کو واضح کر دینا چاہتی ہے کہ چہرہ اور ہاتھوں کو پاؤڈر اور لپ اسٹک سے آراستہ کر کے کھولنا جیسا کہ اس زمانہ میں عام ہے ایک قسم کا تبرّج ہے جس پر شریعت سخت ناپسندی کا اظہار کرتی ہے اور اس سے باز رہنے کی سخت تاکید ہے۔ مجلس کی رائے ہے کہ :-

"چہرے اور ہاتھوں کا کھولنا اس صورت میں جائز ہے جبکہ اس کو فطری حالت پر چھوڑ دیا جائے اور مصنوعی زیبائشوں سے آراستہ نہ کیا جائے۔"

مسلمانوں کی اصلاح و فلاح کے مدِ نظر مجلس ان سے اپیل کرتی ہے کہ وہ اپنی لڑکیوں اور عورتوں کو اس اسلامی طریقے کا پابند کریں اور ان کو سمجھائیں کہ اس طریقہ کی مخالفت ایک طرف تو اللہ تعالےٰ کی ناراضگی کا موجب ہوگی اور دوسری طرف ہمارے اخلاق کی عمارت ڈھا دے گی۔ مجلس مسلمانوں سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اس آیۂ شریفہ کو اپنا نصب العین بنائیں۔

"یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَ اَھْلِیْکُمْ نَارًا وَّقُوْدُھَا النَّاسُ وَالْحِجَارَۃُ" اے ایمان والو! اپنے اور اپنے اہل و عیال کو اس دوزخ سے بچاؤ۔ جس کا ایندھن لوگ

اور بہتر ہیں۔

سورۂ احزاب کی یہ آیت یا ایھا النبی قل لازواجک الخ آیات کے اس سلسلہ کی ایک آیت ہے جو منافقین کے ایک خاص رویّے کی بنا پر نازل ہوئی تھی۔ منافقین نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا۔ کہ کبھی مسلمان مردوں کو مختلف قسم کی ایذائیں دیتے تھے اور کبھی مسلمان عورتوں کے ساتھ فحش کلامی کرتے تھے۔ جیسے وہ زمانہ جاہلیت کی آبرو باختہ عورتوں کے ساتھ کرنے کے عادی تھے۔ اس سلسلے میں یہ آیت نازل ہوئی :۔

اِنَّ الَّذِین یوذُون اللہ و رسولہٗ لعنھم اللہ فی الدنیا والآخرۃ و اعدّ لھم عذاباً مھیناً۔ والذین یُوذُون المومنین والمومناتِ بغیر ما اکتَسَبُوا فقد احتملُوا بُھتاناً و اِثماً مبیناً۔ یا ایُّھَا النبی قل لازواجِکَ و بناتِکَ وَ نِسَاءِ المومنین یُدنین علیھن من جلابِیبِھِنّ ذالِک ادنیٰ ان یُعرفنَ فلا یوذین و کان اللہ غفوراً رحیماً۔ لَئِن لم ینتہِ المنافقون والّذین فی قلوبھم مَرَضٌ والمُرجفُون فی المدینۃِ لِنغرِینَّک بھم ثُمّ لا یجاوِرُونک فیھا الا قلیلاً ملعُونین اینما ثقفُوا اُخِذُوا وقُتِّلُوا تقتِیلاہ

(ترجمہ) جو لوگ ستاتے ہیں اللہ کو اور اس کے رسول کو۔ ان کو پھٹکارا اللہ نے دنیا میں اور آخرت میں اور تیار رکھا ہے ان کے واسطے ذلّت کا عذاب اور جو لوگ تہمت لگاتے ہیں مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کو بغیر گناہ کیے تو اٹھایا انہوں نے بوجھ جھوٹ کا اور صریح گناہ کا۔ اے نبی۔ کہہ دے اپنی عورتوں کو اور اپنی بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں کو نیچے لٹکالیں اپنے اُوپر تھوڑی سی اپنی چادریں۔ اس میں بہت قریب ہے کہ پہچانی جائیں۔ تو کوئی ان کو نہ ستائے اور ہے اللہ بخشنے والا مہربان۔ اور اگر باز نہ آئیں منافق اور جن کے دلوں میں روگ ہے اور جھوٹی خبریں اڑانے والے مدینہ میں۔ تو ہم لگادیں گے تجھ کو ان کے پیچھے۔ پھر نہ رہنے پائیں گے تیرے ساتھ اس شہر میں مگر چند روز پھٹکارے ہوئے جہاں پائے جائیں گے، پکڑے جائیں گے اور جان سے مار دیئے جائیں گے۔

آیۂ کریمہ اس غرض سے نازل فرمائی گئی کہ ایک طرف منافقین کو ان کے کاروبار بد کی سزا سے ڈرایا جائے اور دوسری طرف مسلمان مردوں اور عورتوں کو ہدایات دی گئیں جن کے ذریعے وہ منافقین سے اپنی

حفاظت کر سکیں چنانچہ اس سلسلہ میں یاایھا النبی قل لازواجک ...... سے مسلمان عورتوں کو ہدایت دی گئی کہ وہ اپنے لباس کی وہ وضع اختیار کریں جو ان کو ممتاز کر دے اور شریرالنفس لوگوں پر واضح کر دے کہ یہ شریف عورتیں ہیں۔ ذالک ادنیٰ ان یعرفن فلا یوذین میں جلباب کی یہی مصلحت بتائی گئی ہے کہ وہ پہچانی جا سکیں اور منافقین ان کو ایذا نہ پہنچا سکیں۔ اس میں شک نہیں کہ چادر اوڑھنا اس طرح کہ تمام جسم چھپ جائے مسلمان عورتوں کو دوسری عورتوں سے ممتاز کر دیتا ہے اور اس کے ساتھ ہی اس طریقے میں عفت وعصمت کی حفاظت بدرجہ اتم ہوتی ہے۔ اور وہ شک وشبہ کے مواقع سے محفوظ رہتی ہیں۔

یہی آیہ شریفہ کا مقصد ہے اور اس سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ مسلمان عورت کے لئے عام طور پر اور تمام حالات میں ضروری ہے کہ وہ شک وشبہ کے مواقع سے اپنے آپ کو دور رکھے۔ تاکہ بدباطن اشرار اس کو ایذا نہ پہنچائیں۔ اور اس کی عزت وعصمت کی کافی حفاظت وصیانت ہو سکے۔

(دستخط) محمد عبداللطیف النحام

صدر مجلس افتاء پروائس چانسلر ازہر یونیورسٹی